BIHAR URDU ACADEMY

جون ۲۰۲۴ء

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

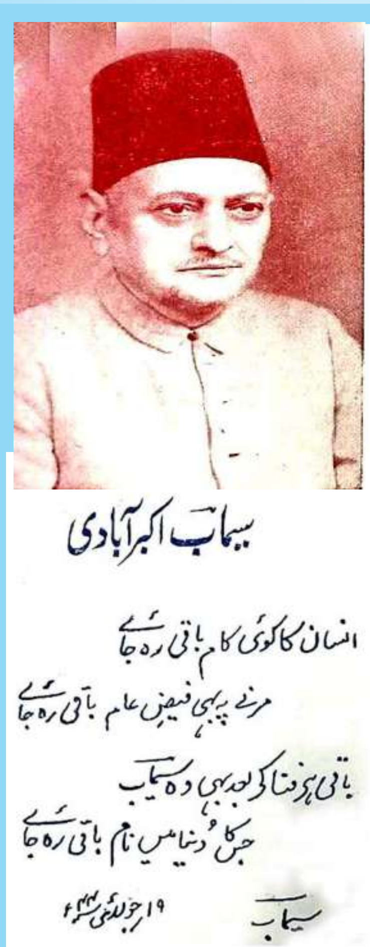

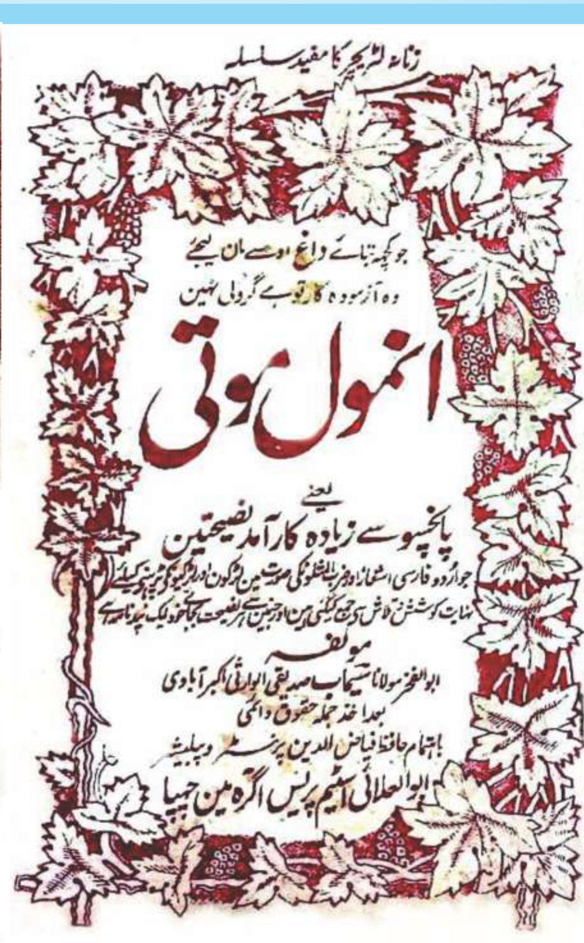

زنانہ لٹریچر کا مفید سلسلہ

جو کچھ بتائے داغ اوسے مان لیجئے
وہ آزمودہ کار ہے گرو لی نہیں

انمول موتی

یعنی

پانچسو سے زیادہ کارآمد نصیحتیں

جو اردو فارسی اشعار اور ضرب المثلوں کی صورت میں لڑکوں اور لڑکیوں کی تربیت کیلئے
نہایت کوشش و تلاش سے جمع کی گئی ہیں اور جن میں سے ہر نصیحت بجائے خود ایک [illegible]

مؤلفہ

ابوالفخر مولانا سیماب صدیقی الوارثی اکبرآبادی

بعد اخذ جملہ حقوق دائمی

باہتمام حافظ فیاض الدین پرنٹر و پبلیشر

ابوالعلائی اسٹیم پریس آگرہ میں چھپا

رباعیات

گمراہوں کو رستہ پہ لگا دے ساقی
منزل کا نشاں کیا ہے بتا دے ساقی
کافور ہو تاریکئ اوہامِ جہاں
وہ شمع یقیں دل میں جلا دے ساقی

❁❁❁

فکر چمنستانِ جہاں کس کو ہے
یارو غم ایامِ خزاں کس کو ہے
بے سود ہے بربادئ ہستی کا گلہ
اس دور میں احساسِ زیاں کس کو ہے

❁❁❁

ہر وقت گناہوں میں گھرا رہتا ہے
پھر بھی وہ بڑا نیک بنا رہتا ہے
زردار کی صحبت نے بتایا یہ راز
دولت ہو تو ہر عیب چھپا رہتا ہے

حفیظؔ بنارسی

حفیظؔ بنارسی کا اصل نام محمد عبدالحفیظ تھا، لیکن شعروادب کی دنیا میں انہوں نے اپنے قلمی نام اور تخلص سے ہی شہرت پایا۔ ان کی جائے ولادت مدن پورہ بنارس اور تاریخ ولادت ۲۰/مئی ۱۹۳۳ء ہے۔ حفیظؔ بنارسی کا تعلق ایک علمی اور تجارت پیشہ خاندان سے تھا۔ ان کے والد الحاج قاری عبدالقیوم اور اُن کے دادا حاجی عبدالعزیز علمی و مذہبی شخصیت کے مالک اور حریری پارچہ جات کی صنعت و فروخت میں اپنی خاص پہچان رکھتے تھے۔ تکمیل تعلیم کے معاً بعد مسلم کالج مئوناتھ بھنجن یوپی میں حفیظؔ بنارسی کی بحیثیت لکچرر تقرری ہوئی اور پھر اگست ۱۹۵۷ء سے مہاراجہ کالج آرہ میں انگریزی کے لکچرر مقرر ہوئے اور یہیں سے ۱۹۹۵ء میں سبکدوش بھی ہوئے۔ ملازمت کا یہی طویل عرصہ ہے جس کی نسبت سے انہوں نے آرہ بہار کو اپنا وطن ثانی کہا ہے اور یہی زمانہ اصلاً ان کی ادبی و شعری شہرت و شناخت کا زمانہ بھی ہے۔ حفیظؔ بنارسی بقول امرت لعل عشرتؔ سلسلہ مصحفی کے ''سخنورانِ بنارس'' میں شمار ہوتے ہیں۔ انہیں شاعری میں مسلّم الحریری سے شرف تلمذ حاصل تھا اور نذیرؔ بنارسی کی ہم نشینی بھی انہیں نصیب تھی۔ انہوں نے شعرائے بہار میں قتیلؔ داناپوری، شاہ فضل امام واقفؔ، نصرتؔ آروی اور جمیلؔ مظہری وغیرہم سے بھی اپنے علمی تعلقات کا بار بار ذکر کیا ہے۔ حفیظؔ بنارسی کا کلیات ''سفیر شہر دل'' ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا اور اس کے ایک سال بعد ہی ۱۶/جون ۲۰۰۸ء بروز دوشنبہ انہوں نے اپنی جان، جاں آفریں کے سپرد کردی اور ریوڑی تالاب بنارس کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

مدیر

ابرار احمد خان

سکریٹری، بہار اردو اکادمی

معاون مدیر

انوار محمد عظیم آبادی

جلد : ۴۵ شمارہ : ۶

جون ۲۰۲۴ء

زرتعاون : پندرہ روپے

سالانہ : ایک سو پچاس روپے

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ: سکریٹری بہار اردو اکادمی، اردو بھون، چو ہٹہ، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ (بہار)

فیکس/فون: 0612-2678021 - 2301476

Web : www.biharurduacademy.in

email : zabanoadabbua@gmail.com

buapat2014@gmail.com

کمپوزنگ : پروین اشرفی

تزئین : زیبا پروین

ترتیب

اداریہ	حرف آغاز	ابراراحمد خان	۳
ذکرِ سیماب	سیمابؔ کا نثری رسالہ: انمول موتی	درخشاں جبیں	۴
	سیماب: عالم آشوب کا شاعر	ایم احمد توصیف	۷
مقالات	سرائے کے باہر: ایک تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر احمد علی جوہر	۱۰
	مشرقی تہذیب کا سچا عاشق: اکبرالہ آبادی	سیفی سرونجی	۱۵
	بدرؔ اورنگ آبادی کی نثری خدمات	ڈاکٹر آفتاب عالم	۱۷
	بیدی کے بَبل پر ایک نظر	ڈاکٹر محمد ثاقب انور	۲۰
یادیں	کچھ یادیں کچھ باتیں سلام بن رزاق کی	صدر عالم گوہرؔ	۲۲
	محمد یونس ہرگانوی: حیات وخدمات	ڈاکٹر محمد ممتاز فرخ	۲۶
	ناشادؔ اورنگ آبادی: یادیں اور باتیں	ثناءاللہ شادؔ دوگھروی	۳۱
افسانے	کھنڈروں میں بسے ہوئے لوگ	رفیع حیدر انجم	۳۷
	شاہین	رئیس صدیقی	۳۹
	خوشبو	راجہ یوسف	۴۱
منظومات	خداوندا......	فخرؔ مہدانوی داناپوری	۴۵
	غزلیں	ظفرؔ رانی پوری	۴۶
	غزلیں	فردوسؔ گیاوی	۴۷
	غزلیں	مختار عالمؔ اعظمی	۴۸
	غزلیں	ڈاکٹر اویناش امنؔ	۴۹
	غزلیں	سعیدؔ قادری	۵۰
	غزلیں	مرزا رضوان بیگ / زویا شاہینؔ	۵۱
	غزلیں	ڈاکٹر مقصود عالم رفعتؔ / سمیع احمد ثمرؔ	۵۲
	غزلیں	شازیہ نیازیؔ	۵۳
	غزلیں	شمع کوثر شمعؔ / محمد فاروقؔ گیاوی	۵۴
کتابوں کی دنیا	اردو ادب...... / پروفیسر محمد توقیر عالم	مبصر: ڈاکٹر ابراراحمد	۵۵
	شمعِ سخن / حبیب غفران ملک	مبصر: شرف الہدیٰ	۵۸
	افکار / نتن پربھاکر مہاجن	مبصرہ: بینش فردوس	۶۰
وفیات	ننگی دوپہر کا سپاہی چل بسا	ادارہ	۶۵
	آہ! شبر امام	ادارہ	۶۶
سلام و پیام	ڈاکٹر شائستہ خاتون، ڈاکٹر ایم۔ضیاء، عاقب محمد، مریم فاروق، محسن باعشن حسرتؔ		۷۰

بچوں کا زبان وادب ۷۳ —— ۸۰

''زبان وادب'' میں شائع ہونے والی تحریروں میں ظاہر کی گئی مصنفین کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

اداریہ

حرف آغاز

شکر بے پایاں مالک لوح وقلم کا ـــــ مجلّہ ''زبان وادب'' کی تازہ اشاعت آپ کے روبرو ہے۔اس اشاعت کا آغاز ''ذکر سیمابؔ'' کے ساتھ ہورہا ہے،جس میں ایک طرف سیمابؔ اکبرآبادی کے عہد وشخصیت سے متعلق کچھ باریک ونفیس نکات کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کے نثری رسالہ ''انمول موتی'' کی اہمیت وافادیت دکھائی گئی ہے اور دوسری طرف سیمابؔ کی حیات وخدمات اور مشاہیر اردو رباعی کا اجمالی ذکر کرتے ہوئے سیمابؔ کے مجموعہ رباعیات ''عالم آشوب'' کی انفرادیت ومزیت آئینہ کی گئی ہے۔

بعدازیں ''مقالات'' کی ابتدا کرشن چندر کے ڈرامہ ''سرائے کے باہر'' کے مبسوط تجزیاتی مطالعہ سے ہوئی ہے اور پھراس حصہ میں کہیں برجستہ و سنجیدہ استدلال کے ساتھ،مشرقی تہذیب سے اکبرؔالہ آبادی کا سچا عشق دکھایا گیا ہے،کہیں مختصر سوانحی جھلکیوں کے ساتھ ''بدرؔاورنگ آبادی کی نثری خدمات'' پر نظر ڈالتے ہوئے ان کے مختلف افسانوں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے اور کہیں مناسب تمہید کے ساتھ بیدی کی کہانی ''ببل'' پر باتیں ہوئی ہیں۔

مزید برآں یہاں ''یادیں'' کی شروعات اُس تحریر سے ہوئی ہے،جس میں مختلف واقعات اور دیرینہ ملاقات کے حوالے سے سلام بن رزاق کی شخصیت کے خاص جلوے دکھائے گئے ہیں اور ان کی افسانہ نگاری اور ترجمہ نگاری کے اوصاف عالیہ کا تذکرہ ہوا ہے،پھر اس حصہ میں دیرینہ ذاتی تعلقات کے اظہار وتجربات اور ضروری اقتباسات وحوالہ جات کا التزام رکھتے ہوئے محمد یونس ہرگانوی کی ہمہ جہت یادیں تازہ ہوئی ہیں اور ذاتی ملاقات ومراسم کے حوالے سے ناشادؔ اورنگ آبادی کی شخصیت،حالات زندگی اور ان کی شاعری ومشاعرہ نوازی کا ذکر خیر آیا ہے۔

یہاں ''افسانے'' کا سلسلہ ''کھنڈروں میں بسے لوگ'' سے شروع ہوا ہے، یہ ان لوگوں کی کہانی ہے جو اصلاً ذہنی کھنڈروں میں بسے لوگ ہیں، اس میں بدلتے وقت کے ساتھ بدلتے ذوق اور نئی ذہنی تبدیلی کے پھیلاؤ کی عکاسی کی گئی ہے اور اس میں خاتون خانہ کا ذہن ساز کردار بھی دکھایا گیا ہے، جب کہ کہانی ''شاہین'' میں گہرا طنز ہی نہیں بلکہ اس کے آخری حصہ میں شاہین کی زبان سے ماں کو ملنے والا جواب ایک بڑا فکر ساز پیغام بھی دے جاتا ہے۔ مزید برآں خالص نفسیاتی کہانی ''خوشبو'' بھی یہ بتا جاتی ہے کہ جب جذبے اور اس کے پیچھے چھپی حقیقت کو سمجھنے میں محض اپنے کسی زعم کی وجہ سے ہونے والی خطا کا احساس جاگتا ہے تو پھر سرتاسر پچھتاوے کے سوا کچھ نہیں ملتا اور مظلوم کے کرب کا احساس بہر حال رُلا دیتا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ نہ صرف مذکورہ نثری مشمولات مطبوع خاطر ہوں گے بلکہ ''منظومات'' کا حصہ بھی پسند آئے گا،''کتابوں کی دنیا'' بھی مطمئن کرے گی اور ''بچوں کا زبان وادب'' بھی انہیں اپنے مطالعہ کی طرف بار بار بلائے گا۔

افسوس صد افسوس کہ گزشتہ مہینہ میں سلام بن رزاق کی رحلت ہوئی اور اس کے محض دس دنوں بعد بہار کے مایہ ناز قلم کار جناب شبر امام بھی چل بسے۔مرحومین کے لئے دعائے خیر پر بار بار آمین کہتے ہوئے خدا حافظ،خدا ناصر!

ابرار احمد خان

(ابرار احمد خان)

ذکرِ سیماب

درخشاں جبیں
Alamganj, Patna - 800007

سیمابؔ کا نثری رسالہ: انمول موتی

اردو کے اربابِ قلم میں سیمابؔ اکبرآبادی (۱۸۸۰ء تا ۱۹۵۱ء) کسی تعارف کے نیازمند نہیں۔ ان کی اصل شہرت اگرچہ شاعری سے ہے، مگر نثر میں بھی ان کی باقیات کچھ کم اہم نہیں اور کہنا چاہئے کہ سیمابؔ کا نثری رسالہ ''انمول موتی'' اس کا ایک خوبصورت ثبوت ہے۔ ۶×۹، انچ کی تقطیع پر چھاپے گئے ایک سو پانچ سال پرانے اس رسالہ کے سرورق اور چند اندرونی صفحات کا عکس اس مضمون کے ساتھ دیا جارہا ہے جو ۲۸ صفحات پر مشتمل اس رسالہ کی بہت ساری تکنیکی اور تعارفی باتیں ازخود ظاہر کردیتا ہے۔ اس رسالہ کو اگرچہ ''زنانہ لٹریچر کا مفید سلسلہ'' بتایا گیا ہے اور سرورق پر اس کتابچہ میں بخط جلی ''پانچ سو سے زیادہ نصیحتیں'' جمع کئے جانے کی بات کہی گئی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس میں صرف ۴۸۹ نصیحتیں ہیں اور یہ صرف لڑکیوں کے لئے خاص نہیں بلکہ ''لڑکوں اور

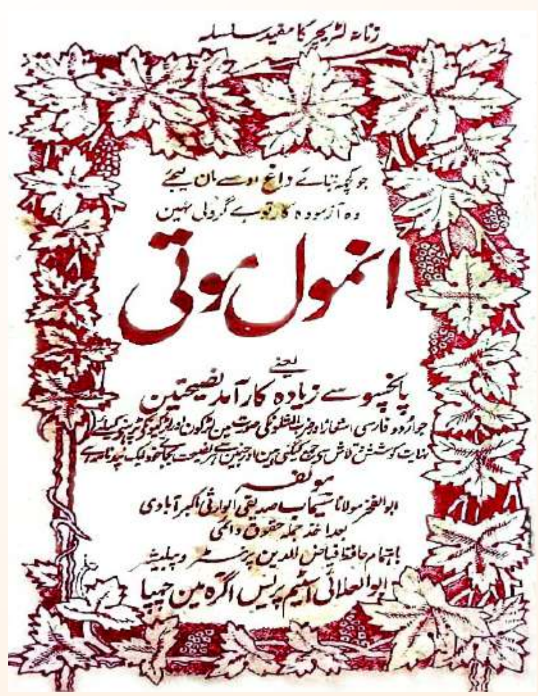

لڑکیوں'' دونوں کے لئے یکساں مفید ہیں۔ اسے بلا تکلف ایک ایسا کامیاب تربیتی کتابچہ کہا جاسکتا ہے، جس میں واقعی ''ہر نصیحت بجائے خود ایک پند نامہ'' ہے۔ اس رسالہ کا نام اس میں دئے گئے آخری قول (نمبر ۴۸۹) سے لیا گیا ہے۔

اس رسالہ کے طابع اور ناشر نے دونوں اندرونی سرورق اور پس ورق پر یک سطری ضرری تعارفی اشارے اور قیمت کی وضاحت کے ساتھ بطور اشتہار اپنے مطبع کی ۵۳ کتابوں کے نام دیے ہیں جن میں ''انمول موتی'' (۲/) کا نام بھی ہے، لیکن اس کے ساتھ اشارتاً ''پوری ایک سو دلچسپ، مفید اور کارآمد نصیحتیں'' لکھا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی دوسری ہم نام کتاب ہے۔ بہرکیف اس سے قطع نظر جہاں تک سیمابؔ کے زیر مطالعہ کتابچہ کے بالاستیعاب مطالعہ کا تعلق ہے، اس میں اقوال ناصحانہ کی شروعات سے پہلے بصورت مقدمہ یا دیباچہ، مولف رسالہ نے حدیث پاک سے غذا لیتے ہوئے اصلاحی کاوش کے جواز کا فلسفہ نہایت عالمانہ انداز میں لکھ دیا ہے اور محض ایک صفحہ کی اس تحریر میں یہ بھی بتادیا ہے کہ اس موضوع پر سابقہ کتابوں میں محض سو، پچاس اقوال کی یکجائی سے بے اطمینانی محسوس کرتے ہوئے، ذہن کو تحریک دینے والے اسلوب میں، افادۂ عامہ کے مقصد سے یہ رسالہ لکھا گیا ہے، جو ملک کے حق میں اخلاقی فلاح کی فکر کا نتیجہ ہے۔

سیمابؔ اکبرآبادی کے اس کتابچہ میں صفحہ۲ سے صفحہ آخر تک جو منثور و منظوم اقوال جمع کئے گئے ہیں، وہ ظاہر ہے کہ سرتاسر اخلاق و نصیحت کے موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں خوف وشکر، والدین کی اطاعت، جھوٹ کی آفت، گفتگو، میزبانی، شکار، طعام اور مطالعہ کتاب کے آداب، وقت، علم، صبر وقناعت، غرور اور دل آزاری سے اجتناب، خیالات و عقائد کی اصلاح جیسے موضوعات پر بیش قیمت ناصحانہ اقوال کے دوش بدوش،

سفر وحضر کی ضروریات، نفسیاتی نکات و جہات اور حفظانِ صحت کے تعلق سے بھی متعدد اقوال موجود ہیں مثلاً:

''تمبا کھانا پینا آنکھوں کی روشنی کو کمزور کرتا ہے (قول نمبر۵۳) اتنا نہ کھاؤ کی چورن کی جگہ بھی باقی نہ رہے (۸۳) سرخ مرچ کی زیادتی بینائی کو کم کر دیتی ہے (۲۹۵) کھانا کھاتے ہی سو رہنا بدہضمی پیدا کرتا ہے (۷۸) پان منھ میں دبا کر نہ سو جاؤ، بدبو آئے گی (۹۰) کھانا کھا کر پیخانے کی عادت نہ ڈالو (۹۲) کہیں سے چل کر آؤ تو فوراً پانی نہ پیؤ (۹۱) دھوپ سے فوراً سائے میں اور سائے سے فوراً دھوپ میں نہ جاؤ (۱۱۵) جوتا ہمیشہ ڈھیلا پاؤں میں کھلتا ہوا پہنو (۸۱) آدھے سائے اور آدھی دھوپ میں کبھی نہ بیٹھو (۱۱۶) جب بجلی چمکتی ہو تو کھلے سر نہ بیٹھو، نہ کوئی کالا کپڑا پاس رکھو (۱۹۶) چکنی چیز کھا کر پانی نہ پیؤ (۱۹۸)''

یہ اقوال بتا رہے ہیں کہ اس کتابچے میں چھوٹے بچوں کو سکھائی جانے والی ابتدائی نوعیت کی باتوں کو خصوصیت سے جگہ ملی ہے، مگر اسی پر بس نہیں، کیوں کہ اس کتابچہ کے بعض اقوال، قول فیصل کے انداز میں بھی ہیں اور بعض اقوال میں یک گونہ گھریلو ٹوٹکے والا انداز بھی ملتا ہے اور کہیں کہیں صوفیانہ وفلسفیانہ اور خاص تربیتی انداز بھی، مثلاً:

''میٹھی زبان بادشاہ بنا دیتی ہے (قول نمبر۴۵۸) علم بے عمل کے کام نہیں دیتا (۴۳۷) وعدہ کرو تو پورا کرو، اسی کا نام جوانمردی ہے (۳۷) اونچی نگاہیں کر کے چلنا شریروں کی پہچان ہے (۱۲۹) زیادہ تھوکنے سے چہرا پھیکا ہو جاتا ہے (۶۲) چٹوری زبان سے دولت کا نقصان ہوتا ہے (۲۱۱) یارِ شاطر بارِ خاطر ہوتا ہے (۲۲۰) ہٹ دھرمی اور سخن پروری بری چیز ہے (۲۸۶) محنت سونے سے بہتر ہے (۲۹۰) دولت سے شرافت نہیں ہوتی (۲۹۲) ایمان ہے تو جہان ہے (۳۴۰) چاندی کے کٹوروں کو بھیک کی کمی نہیں رہتی (۳۶۷) کبھی زہر دوا کا کام کر جاتا ہے اور کبھی دوا زہر کا کام دیتی ہے، اس کا تعلق قسمت سے ہے (۳۳۶) دوراندیش کو کبھی پچھتانا نہیں پڑتا (۲۵۴) ارادہ انسان کا فرض ہے اور تکمیل خدا کے ہاتھ ہے (۴۲۷)''

سیمابؔ کے اس رسالہ کی ورق گردانی سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں موضوعات کا زبردست تنوع ہے اور بیشتر اقوال، آسانی سے یاد رہ جانے والے مختصر ترین اقوال ہیں۔ بعض اقوال سجاعت اور ہندی ترکیب سے آراستہ ہیں اور قواعدی لحاظ سے صرف جملہ خبریہ کی شکل میں نہیں بلکہ اکثر جملہ انشائیہ کی شکل میں بھی ہیں۔ تحریر میں آنے کے بعد بعض اقوال میں تحت نقاط یا فوق نقاط جملہ کی شان بھی آ گئی ہے، مثلاً:

''پہلے سوچو پھر بولو (قول نمبر۱۲۲) سوائے خدا کے کسی اور کی قسم نہ کھاؤ (۲۵۰)''

البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کتابچہ کا طرزِ کتابت قدیم ہے مثلاً:

''اچھــی (اچھی) اونسـے (اُن سے) پڑہو (پڑھو) پہر (پھر) بہید (بھید) اٹھـائینگی (اٹھائیں گی) تنبا کو (تمبا کو) اونگلی (انگلی) مکھیوں (مکھیوں)''

سیمابؔ کے اس کتابچے میں فارسی اشعار، مصارع اور ضرب الامثال

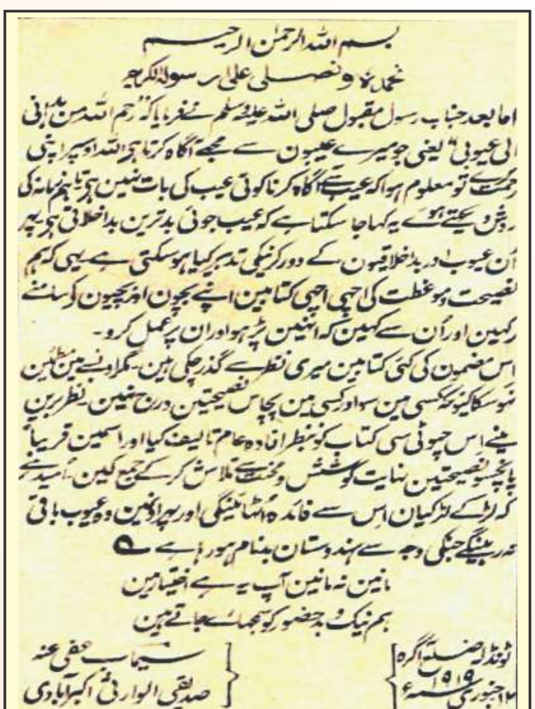

بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم
اما بعد جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "رحم اللہ من اہدیٰ الی عیوبی" یعنی جو میرے عیبون سے مجھے آگاہ کرتا ہے اللہ اوسپر اپنی رحمت کرے تو معلوم ہوا کہ عیب سے آگاہ کرنا کوئی عیب کی بات نہین ہے تاہم زمانہ کی روش دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ عیب جوئی بدترین بداخلاقی ہے پھر اُن عیوب و بداخلاقیون کے دور کرنیکی تدبیر کیا ہو سکتی ہے یہی کہ ہم نصیحت و موعظت کی اچھی اچھی کتابین اپنے بچون اور بچیون کو سامنے رکھین اور اُن سے کہین کہ انہین پڑہو اور ان پر عمل کرو۔
اس مضمون کی کئی کتابین میری نظر سے گذر چکی ہین مگر اونسے مین مطمئن نہو سکا کیونکہ کسی مین سو اور کسی مین پچاس نصیحتین درج ہین نظر برین مینے اس چھوٹی سی کتاب کو بنظر افادہ عام تالیف کیا اور اسمین قریباً پانچسو نصیحتین نہایت کوشش و محنت سے تلاش کر کے جمع کین۔ امید ہے کہ لڑکے لڑکیان اس سے فائدہ اٹھائینگی اور بہرا ئین وہ عیوب باقی نہ رہینگے جنکی وجہ سے ہندوستان بدنام ہو رہا ہے ۔
مانین نہ مانین آپ یہ بے اختیار ہین
ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہین
ٹونڈلہ ضلع آگرہ ۱۲ جنوری ۱۹۱۵ء
سیماب عفی عنہ صدیقی الوارثی اکبرآبادی

جگہ جگہ ملتے ہیں۔ایک محتاط اندازے کے مطابق محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً دسیوں فارسی اشعار اور بیسیوں فارسی مصارع یہاں شامل ہیں مثلاً۔

ز جاہل گریزندہ چون تیر باش
نہ آمیختہ چون شکر شیر باش

ع: خدا خود میر سا مانست ارباب توکل را
ع: کسب کمال کن کہ عزیز جہان شوی

نیکی کا لطف یہ ہے انسان کر کے بھولے
احسان کا مزہ ہے احسان کر کے بھولے

ع : جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں
ع : خاک کے پتلے کو بیشک خاکساری چاہئے
ع : دنیا ہے چل چلاؤ کا رستہ سنبھل کے چل
ع : جس نے دیا ہے تن کو دے گا وہی کفن کو

(اقوال نمبر ۳۸۵،۳۴۳،۲۶۹،۴۲۱،۴۲۹،۱۵۱،۳۹۴،۴۱۶)

البتہ ان کے مقابلے میں عربی اور ہندی کہاوتیں بسا کم کم ہیں، جس سے یہ ذہن ملتا ہے کہ اُس دور میں فارسیات کی عملداری کتنی نمایاں تھی۔

مذکورہ نکات اپنی جگہ،لیکن میں یہاں اپنے مضمون کو اختتام تک لے جانے سے پہلے چند خاص باتوں کا ذکر بھی ضروری سمجھتی ہوں، ایک بات تو یہی ہے کہ انیسویں صدی کے بالکل اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں کچھ مہلک وبائیں تیزی سے آئی تھیں اور سیمابؔ جیسا

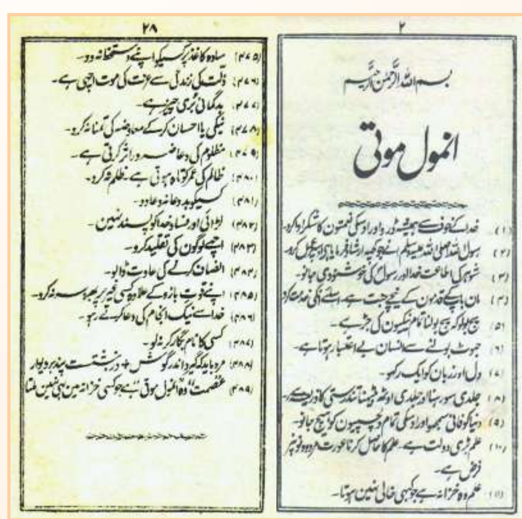
۲ ۲۸
بسم اللہ الرحمن الرحیم
انمول موتی

حساس فن کار اس سے بھی غافل نہ تھا کہ صحت مند آبادی کا خیال رکھنا اور اس پر توجہ دینا ملک کی ترقی کے لئے کس قدر لازمی ہے،شاید یہی وجہ ہے کہ اس کتابچہ میں طبی نصائح کو واضح جگہ دی گئی ہے، دوسری بات یہ کہ ''انمول موتی'' کی یہ مالائے مروارید جس دور میں تیار ہوئی ہے، وہ سیاسی لحاظ سے رولٹ بلز اور قانون ہند بابت ۱۹۱۹ء پر زبردست بے اطمینانی کے ساتھ عام احتجاج کا زمانہ تھا اور اس کے خلاف ہر طرف جلسے جلوس ہو رہے تھے اور تازہ سیاسی معلومات کے لئے اخبار کی خاص اہمیت تھی۔ میرے خیال میں شاید اسی ماحول کا اثر آیا ہے کہ''انمول موتی''میں یہ اقوال بھی شامل ہوئے ہیں:

''اخبار پڑھ کر حفاظت سے رکھ دو (قول نمبر۳۱۲)
ہندوستانی محفل میں بوٹ جوتا پہن کر نہ جاؤ(۱۸۷)''

اور پھر تیسری بات یہ بھی کہ ۱۸۵۹ء سے ریل کا سفر عام ہوا اور اُس کے تقریباً ۴۶ سال بعد ۱۹۰۵ء میں جب ریلوے بورڈ کا قیام ہوا تو وہ سیمابؔ کی عین جوانی کا زمانہ تھا۔ انہوں نے اپنے والدین سے یقیناً ریل کے سفر کی باتیں سنی ہوں گی، پھر یہ بھی ہم جانتے ہیں ہ وہ محکمہ ریلوے کی ملازمت میں رہ چکے تھے،یہی وجہ ہے کہ''انمول موتی''میں انہوں نے درج ذیل اقوال بھی شامل رکھا ہے:

''ریل میں ہمیشہ پچھلی گاڑی میں بیٹھو، اسٹیشن پر ہمیشہ وقت سے پہلے پہنچو، ریل میں کبھی نہ سونا چاہئے، ٹکٹ نمبر لکھ لینا بڑی دانائی ہے''(قول نمبر ۲۱،۲۲،۱۸۵،۱۸۶)

مختصر یہ کہ سیمابؔ اکبرآبادی کا یہ نثری رسالہ کئی اعتبار سے اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اور اپنے موضوع پر اقوال حسنہ کا دائرہ صرف کمیت کے لحاظ سے نہیں بلکہ کیفیت کے لحاظ سے بھی اس طرح وسیع کر دیتا ہے کہ اس میں بہت سی باتیں اُس دور کی نئی ایجاد کے لحاظ سے تہذیبی اور احتیاطی ضرورت کے طور پر بھی شامل کی گئی ہیں۔

مذہب اور اخلاق کا چولی دامن کا ساتھ ہے، پھر بھی یہ اخلاقی رسالہ ہے اور سیمابؔ نے اسے واضح طور پر خالص مذہبی ترجیحی رسالہ بننے سے بچایا ہے اور چونکہ وہ خود شاعر و ادیب ہیں لہٰذا انہوں نے اس رسالہ میں ادبی چاشنی کے کافی سامان بھی رکھ دیے ہیں۔

ایم احمد توصیف
Bairia, P.o. Kolhua, Paighambarpur, Yahiyapur, Kanti, Muzaffarpur - 843113

سیمابؔ: عالم آشوب کا شاعر

ادب اردو کی تاریخ میں عاشق حسین سیمابؔ اکبرآبادی کا نام اور ان کا علمی وشعری مقام کسی رسمی تعارف کی ضرورت سے یقیناً بے نیاز ہے۔ سیمابؔ نے تاج کی دھرتی پر۱۸۸۳ء میں آنکھیں کھولیں اور اپنے فیضان علم وفن سے جہانِ سخن کو مدتوں سیراب کر کے، کراچی کی دھرتی پر ۱۹۵۱ء میں آخری سانس لی اور وہیں آسودۂ خاک ہوئے۔ جیسا کہ ڈاکٹر سید اعجاز حسین نے اپنی کتاب ''مختصر تاریخ ادب اردو'' میں لکھا ہے، انہیں ۱۸۹۹ء میں داغؔ دہلوی سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا اور ظاہر ہے کہ عنفوان شباب میں یہ دولت نصیب ہونے کے بعد، نہ صرف ان کی راہِ سخن روشن ہوتی چلی گئی بلکہ اس کی بدولت دوسروں کے لئے بھی یہ راہ تابندہ ہوتی رہی۔ یہ بات اپنی جگہ کہ:

> ''سیمابؔ اکبرآبادی غزل میں فن زبان اور محاورے پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ جدید میلانات ان کے کلام میں نہیں ملتے۔'' (اردو انسائیکلوپیڈیا، ۱۹۹۶ء ج ۱ص ۶۹)

لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آگرہ دبستان کے بانی کی حیثیت سے ان کا خاص تاریخی مقام ہے۔ انہوں نے ۱۹۲۱ء میں ''قصر ادب'' کے نام سے جو ادارہ قائم کیا تھا، وہ اپنی نوعیت کا بہت ہی منفرد ادارہ تھا، جس میں نو آموز شعرا کے کلام پر اصلاح دی جاتی تھی۔ دور دور کے شعرا اپنا کلام اصلاح کے لئے بھیجتے تھے۔ یہ پہلا ادارہ تھا جس نے منظم طور پر شعرا کی تربیت کا انتظام کیا۔ مزید یہ بھی کہ سیمابؔ اصلاً نظم کے شاعر تھے، بقول عظیم الحق جنیدی:

> ''ان کی نظموں میں سیاسی رنگ اور وطنیت کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ انہوں نے ملک کے معاشرتی حالات اور مسائل کو خوبی کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔'' (اردو ادب کی تاریخ، اشاعت پنجم ۱۹۸۲ء، مطبوعہ علی گڈھ، ص ۱۴۷)

اور بقول ڈاکٹر سید اعجاز حسین:

> ''آپ کا دوسرا مجموعہ ''کارامروز'' نظموں کا ذخیرہ ہے جس کے دیکھنے سے آپ کی وسیع النظری اور ہندوستان بلکہ دنیا کے ہمہ گیر مسائل سے دلچسپی کا ہر جگہ ثبوت ملتا ہے۔'' (مختصر تاریخ ادب اردو، اردو کتاب گھر، دہلی، گیارہواں ایڈیشن ۱۹۶۴ء، ص ۱۷۱)

لیکن فی الوقت سیمابؔ کی شاعرانہ فتوحات کے تعلق سے ہمیں مذکورہ بالا پہلوؤں کی تفصیل میں جانا مطلوب نہیں بلکہ آخر الذکر دونوں اقتباس کے حوالے سے ہم اس نکتہ کی طرف آنا چاہتے ہیں کہ ان میں جو باتیں سیمابؔ کی نظموں کے تعلق سے کہی گئی ہیں، ان کا ایک اور ثبوت ان کی رباعیوں کے مطالعہ سے بھی سامنے آجاتا ہے۔

اردو زبان میں یوں تو ابتدائی دور سے لے کر اب تک نہ جانے کتنے ہی شاعروں نے رباعی گوئی سے شغف دکھانا چاہا ہے، لیکن فی الواقعہ انیسؔ و دبیرؔ، حالیؔ و اکبرؔ، رواںؔ و امجدؔ اور جوشؔ و فراقؔ جیسے ان شاعروں کی فہرست میں، جو اس صنف کے حوالے سے خاص شہرت پا سکے ہیں، سیمابؔ اکبرآبادی کا نام کسی تکلف و اور تامل کے بغیر شامل کیا جاسکتا ہے۔

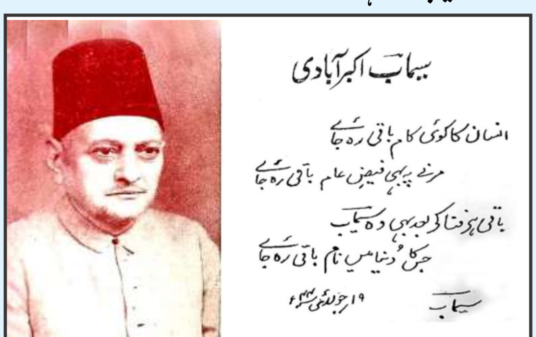

عکس تحریر اور تصویر ماخوذ از اردو شعرا کا مصور تذکرہ

سیمابؔ اکبرآبادی کے بائیس شعری مجموعے میں ان کا ''عالم آشوب'' نامی مجموعہ بھی شامل ہے۔ سیمابؔ کی رباعیوں کا یہ پاکٹ سائز مجموعہ ۴۳۰ صفحات پر مشتمل ہے جو آج سے اسی سال پہلے ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں نفسیاتی بیانات، جنگ عالمگیر اور اس وقت کے لحاظ سے واقعات حاضرہ پر تین سو سے زیادہ اشاراتی اور تاریخی رباعیاں موجود ہیں۔ حامد اقبال صدیقی کے لفظوں میں:

''حضرت سیمابؔ اکبرآبادی نے ہزاروں کی تعداد میں رباعیاں کہیں...... مذہب، سیاست، سماج، تاریخ، قدرت، نفسیات، جذبات غرض کہ ہر موضوع پر ان کے یہاں رباعیاں ملتی ہیں جنہیں پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ رباعی کہنا ان کی استادانہ ضرورت نہیں بلکہ فطرت تھی......'' (مقالہ بہ عنوان: ''سیمابؔ اکبرآبادی کی رباعیوں کا مجموعہ: عالم آشوب''، ماہنامہ ''شاعر''، ممبئی جولائی ۲۰۱۹ء، ص ۲۱)

سیمابؔ اکبرآبادی کی رباعیاں اپنے وقت کے مقتدر رسائل اور خود ان کے رسالہ ''پیمانہ'' اور ''شاعر'' میں کثرت سے چھپتی رہیں۔ یہ رباعیاں موضوع کے لحاظ سے سیاسی، سماجی، ادبی اور اصلاحی ہوا کرتی تھیں۔

سیمابؔ کی رباعیوں کو اپنے زمانے کی سیاسی، معاشرتی اور مذہبی تہذیب کا مظہر کہا گیا ہے تو یقیناً اس میں بے جا مبالغہ نہیں۔ بلاشبہ سیماب کے ''عالم آشوب'' کی یہ بھی بہت ہی تاریخی اہمیت ہے کہ اس میں دوسری عالمگیر جنگ پر متعدد رباعیاں ملتی ہیں۔ سیمابؔ کے اس مجموعہ کا ''پیش لفظ'' سید محمد محمود رضوی مخمورؔ اکبرآبادی نے لکھا ہے اور سیمابؔ کو ''رباعی کے مشاقوں'' میں شمار کرتے ہوئے بتایا ہے کہ:

''وہ غور وفکر کے بعد حقیقت میں اس وقت رباعی کہتے

ہیں جب اس کا موضوع مشکل ہو کر ان کے سامنے آجاتا ہے، اس لئے ان کی رباعیوں میں بڑی واقعیت ہے۔ اس مجموعہ میں انہوں نے فلسفے کے بجائے سیاست حاضرہ کو موضوع بنایا ہے۔ جوشؔ کی رباعیوں میں مذہب اور سماج پر طنز ہے تو سیمابؔ نے اس پیکر میں حوادث پر تبصرہ کیا ہے...... سیمابؔ کی رباعیاں فکر، عمق اور نظر کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ وہ اہم باتوں کو بڑی سادگی سے بیان کر جاتے ہیں اور حسن بالائے حسن یہ ہے کہ اسلوب بیان کے تعین کے وقت وہ ملک کے نیچے سے نیچے ذہن کو بھی فراموش نہیں کرتے۔ ان کی رباعیوں میں ایک لطیف مقصد پنہاں ہے جس میں تبلیغی پہلو بہت اہم ہے۔ ماہ بہ ماہ ترتیب (اواخر مئی ۱۹۴۰ء سے اوائل دسمبر ۱۹۴۳ء تک) کے التزام سے اس مجموعہ میں ایک تاریخی شان بھی پیدا ہوگئی ہے جو مستزاد ہے...... یہ رباعیاں بہرحال آپ اپنی دلکشی کی ضمانت ہیں۔''

مذکورہ بیان سے گزرنے کے بعد اب سیمابؔ کی چند رباعیاں دیکھئے۔

دبنے سے دبانے سے نہیں مٹ سکتی
یا خون بہانے سے نہیں مٹ سکتی
جس قوم کو احساس ہو قومیت کا
وہ قوم مٹانے سے نہیں مٹ سکتی

تہذیب و سکون کا ہو وہ منظر پیدا
انسان دل انساں میں کرے گھر پیدا
کردو انسانیت کو اس درجہ بلند
پھر ہو نہ سکے جہاں میں ہٹلر پیدا

ہر نفس پریشان ہے اور کچھ بھی نہیں
جھگڑے ہیں اور انسان ہے اور کچھ بھی نہیں
تھی وسعت عالم کبھی جنت بکنار
اب جنگ کا میدان ہے اور کچھ بھی نہیں

سیمابؔ کی مذکورہ رباعیاں یقیناً یہ بتانے میں کامیاب ہیں کہ قومیت کا سچا احساس وشعور ہی قوموں کی دائمی فتح وبقا کا ضامن ہوتا ہے اور ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ ہم دلوں کو جیت لینے کا راستہ اپنائیں اور امن وتہذیب کے مناظر کو ہٹلر یعنی ظالمانہ انانیت پسند چہروں کے کردار ومناظر سے داغدار اور متوحش نہ ہونے دیں، یہاں شاعر نے اپنے دور کے رزمیہ ماحول ومناظر کی جس طرح سادہ اور سچے لفظوں میں عکاسی کی ہے، وہ بھی دیدنی ہے۔اسی طرح سیمابؔ نے کہیں گرسنہ حال انسانوں کا مرتبہ دکھا کر بروقت نیکی کی ترغیب دی ہے اور ''دل بدست آور......'' کے پیغام رومی کو اپنی رباعی میں ڈھال لیا ہے تو کہیں اپنے دور کی عام سفا کی اور چنگیزیت کا نقشہ بھی موثر انداز سے دکھادیا ہے ۔

بھوکا نہیں ، اک پیش کش فطرت ہے
کس میں اس کے قبول کی ہمت ہے
تھوڑا سا کرے خرچ بہت سا لے لے
بھوکے کی دعا بھی اک بڑی نعمت ہے

دل جس نے محبت سے یہاں جیت لئے
اس نے دراصل دو جہاں جیت لئے
دل توڑ دیا شکست کامل پائی
دل جیت لیا کون و مکاں جیت لئے

دنیا کا یہ دور حیرت انگیز ہے آج
چیونٹی بھی بزعم خویش چنگیز ہے آج
ہے سارے جہاں کو مرض جوع الارض
آتش کدۂ خودی بہت تیز ہے آج

سیمابؔ کی رباعیاں واقعی ''عالم آشوب'' کی عکاس وترجمان ہیں، مگر لطف کی بات یہ ہے کہ شاعر نے کہیں بھی حرماں نصیبی کا ماتم نہیں کیا ہے اور نہ ہی صرف منظر کشی سے سروکار رکھا ہے، بلکہ واضح طور پر اُن مناظر کو بدلنے کی راہ دکھائی ہے اور عصری تناظر میں تجربے ومشاہدے کے حوالے سے فروغ انسانیت کے لئے بروقت اُٹھ کھڑے ہونے کی ضرورت کا احساس دلایا ہے اور صاف لفظوں میں بتایا ہے کہ انسان ہزار طاقتور سہی، مگر اس کی طاقتوں پر قادر بھی ایک ذات موجود ہے۔ جنگ تو نیستی کا حیلہ بہانہ ہے، مگر یہ سوچنا ضروری ہے جب انسان ہی اس دنیا میں نہیں رہے گا تو اقتدار پا کر بھی اقتدار کے بھوکے کس پر حکومت کریں گے۔ زمانے کے پیچ وخم سے آگاہ نہ رہنے والوں کا مقدر گم گشتگی کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اس لئے راستہ کی کیفیت کو سمجھنے کے لئے قدم اٹھانے سے پہلے نظر اٹھانا لازمی ہے ۔

سن بات مری بطیّب خاطر اک اور
ہے آخری التماس شاعر اک اور
رکھ یہ بھی یقیں کہ تجھ میں ہر قوت ہے
اور یہ بھی کہ تجھ پر بھی ہے قادر اک اور

یہ جنگ ہے نیستی کا حیلہ سا خالی
کر دے گی جہاں کا گوشہ گوشہ خالی
انسان کرے گا پھر حکومت کس پر
انسان سے ہوگئی جو دنیا خالی

آگاہ نہ تھے جو پیچ وخم سے پہلے
وہ قافلے کھوئے گئے ہم سے پہلے
یہ دیکھ لے راہ تو نہیں ناہموار
تو اپنی نظر اٹھا قدم سے پہلے

''عالم آشوب'' کے حوالے سے سیمابؔ کی رباعیوں اور خصوصاً اس مضمون میں شامل رباعیوں پر ایک بار پھر طائرانہ نظر ڈالی جائے تو یہ احساس مشکل نہیں کہ ان میں زبان دانی اور سہل ممتنع کی بڑی شان پنہاں ہے۔ بلاشبہ یہ رباعیاں محض ایک آدھ لفظوں کی ترتیب بدلنے سے نثر میں ڈھل جانے والی رباعیاں ہیں اور ان میں حسن تراکیب، استعارات اور ازیں قبیل بیان وبدائع کے صدہا جلوے بھی آسانی سے ڈھونڈ لئے جاسکتے ہیں۔ سیمابؔ محض تفرج پسند شاعر نہیں تھے، بلکہ اس فن شریف سے وہ پیامی رنگ میں ذہن سازی کے بھی بڑے ماہر تھے اور حقیقت یہ ہے کہ ''عالم آشوب'' کی رباعیاں ان کے اس مرتبہ پر یک بار نہیں صد بار صاد کرتی چلی جاتی ہیں۔ ❁❁

مقالات

ڈاکٹر احمد علی جوہر

Assistant Prof. Dicpline of Urdu, School of Heomenities,
Indira Gandhi National Open University, New Delhi - 110067 (Mob. 9987438699)

سرائے کے باہر: ایک تجزیاتی مطالعہ

کرشن چندر (۱۹۷۷ء-۱۹۱۴ء) اُردو فکشن کا ایک نمایاں اور معتبر نام ہے۔ انہوں نے اُردو کی بیش تر نثری اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اور افسانے، ناول، ناولٹ، انشائیے، رپوتاژ، خاکے، ڈرامے، فیچر اور طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھے ہیں۔ وہ ایک اجتہادی افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے اُردو افسانے میں نت نئے تجربے کیے ہیں۔

افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ کرشن چندر نے ڈراما نگاری کو بھی اپنے فکر وفن کا وسیلہ بنایا۔ یوں تو کرشن چندر نے ڈراما نگاری کا آغاز قیام لاہور کے زمانۂ طالب علمی سے کر دیا تھا، لیکن ان کے ڈراموں کو اس وقت جلا ملی جب وہ نومبر ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا ریڈیو میں پروگرام اسسٹنٹ کی حیثیت سے داخل ہوئے اور لاہور، دہلی اور لکھنؤ جیسے اسٹیشن پر تقریباً تین سال اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔

کرشن چندر ان ریڈیو اسٹیشنوں پر جب تک رہے، ان کے گرد اُردو ادیبوں کی ایک کہکشاں ہمیشہ رہی۔ یہاں انھیں سازگار ماحول ملا جس میں انہوں نے متعدد ریڈیائی ڈرامے لکھے اور وہ اسٹیج بھی ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ کرشن چندر کی باضابطہ ڈراما نگاری کی ابتدا کا زمانہ ان کی اسی ملازمت کے دوران کے عہد کو مانا جاتا ہے۔

اس زمانے میں کرشن چندر نے ریڈیو کے لیے اچھے اچھے ڈرامے فنی سوجھ بوجھ کے ساتھ اپنے مخصوص انداز میں تحریر کیے اور وہ نشر بھی ہوئے۔ ساتھ ہی انھوں نے جدید طرز کے مغربی ڈراموں کا ترجمہ بھی کیا۔ ان کے ڈراموں میں جدید خیالات اور میلانات کی کارفرمائی بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید اُردو ڈرامے کے فروغ میں ان کے ڈراموں کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ زبیر رضوی نے کرشن چندر کی ڈراما نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ترقی پسندوں میں کرشن چندر اور اپندر ناتھ اشک نے سب سے زیادہ ڈرامے اسٹیج کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر لکھے۔ ان ڈراموں میں اپنے زمانے کا سارا دُکھ درد، سوچ اور فکر اور جلتے سلگتے مسائل پوری شدت کے ساتھ اُبھر کر آئے ہیں۔ یہ سب ادیب سماجی سچائیوں اور حقیقتوں پر زور دے کر ڈرامے لکھتے رہے تھے، چوں کہ ان کی تمام تر رُوح ہندوستانی تھی اور واقعات روزمرہ کی زندگی اور اس کے پریشان کن مسائل سے جڑے ہوئے تھے۔'' (آزادی کے بعد اُردو اسٹیج ڈرامے، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۸ء، ص ۷)

کرشن چندر کی ڈراما نگاری کا دور یورپ میں Ibsen چیخوف اور برناڈ شا کی سماجی حقیقت پسندی کا عہد تھا۔ کرشن چندر نے بھی ان کا تتبع کیا اور سماجی، سیاسی، اقتصادی اور طبقاتی تضادات کو اپنے ڈراموں میں پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

کرشن چندر اشترا کی فکر و فلسفہ سے بے حد متاثر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ڈراموں میں اشترا کی حقیقت پسندی کی واضح جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کے ڈراموں کا پہلا مجموعہ ''دروازہ'' ہے جو آزادی سے پہلے اُردو اکیڈمی لاہور نے شائع کیا تھا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن تقسیم ہند کے بعد ''آزاد بک ڈپو' ہال بازار، امرتسر سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں کل چھ ریڈیائی ڈرامے ہیں۔ اس کے تقریباً سبھی ڈرامے ۱۹۳۷ء ۱۹۴۱ء کے درمیان نشر ہو چکے تھے۔ ان کا پہلا طبع زاد ڈراما ''بیکاری'' تھا۔ ان کے بیشتر ڈرامے ہندوپاک کے موقر رسائل میں شائع بھی ہوئے۔ ''بیکاری'' (ہمایوں، لاہور، مئی ۱۹۳۷ء) ''قاہرہ کی ایک شام''، ''دروازہ'' (ساقی،

دہلی، اکتوبر ۱۹۴۰ء) ''حجامت'' (ادب لطیف، لاہور، اگست ۱۹۴۱ء)، ''نیل کنٹھ''اور''سرائے کے باہر'' (ساقی، دہلی، مئی ۱۹۴۲ء) وغیرہ ان کے اہم ڈرامے ہیں۔

کرشن چندر نے اپنے اشتراکی نظریات کو اپنے فکشن کے ساتھ ساتھ اپنے ڈراموں میں بھی پیش کیا۔ انہوں نے اپنے آس پاس کی زندگی کا گہرا مشاہدہ کیا اور دبے کچلے طبقوں کی زندگی کو ان کے معاشرتی سیاق و سباق میں دیکھنے دکھانے کی حتی الامکان کوشش کی۔ وہ ہمیشہ کسان، مزدور اور بھیک منگے کے ہم نوا بن کر ان کے درد و کرب میں شریک رہے۔ جس اخلاص سے ان کے مسائل کو کرشن چندر نے محسوس کیا، اسی طرح اسے خوب صورت پیرائے میں بیان کرنے کی بھی سعی کی۔ انہوں نے سامراجی اور سرمایہ دارانہ نظام کی برائیوں کو بے باکی سے اپنی تنقید کا نشانہ بنایا اور رومانیت کی چاشنی میں اسے پیش بھی کیا۔

کرشن چندر کا مشہور ڈراما ''سرائے کے باہر'' مذکورہ خوبیوں کا دل کش ترجمان ہے۔ یہ ڈراما ان کے مجموعہ ''دروازہ'' کا آخری ڈراما ہے۔ سب سے پہلے یہ ڈراما مئی ۱۹۴۲ء میں رسالہ ''ساقی''، دہلی میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد ریڈیو پر نشر ہوا۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے خصوصی پروگراموں میں بھی اس ڈراما کو بار بار پیش کیا گیا۔

اس ڈراما کو کرشن چندر نے دہلی میں قیام کے دوران لکھا تھا۔ یہ وہی ڈراما ہے جس پر اپنی فلم کمپنی ''ماڈرن تھیٹرز'' میں ۱۹۴۵ء میں انہوں نے فلم بھی بنائی تھی جس میں مہندر ناتھ نے ہیرو اور بیتا دیوی نے ہیروئن کے رول ادا کیے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ فلم فلاپ ہو گئی تھی۔ اس ڈرامے کے کرداروں میں اندھا بھکاری، منی جو اندھے بھکاری کی نوجوان لڑکی ہے، بھکارن یعنی اندھے بھکاری کی بیوی، جانی لنگڑا، ایک آوارہ شاعر، سرائے کا مالک، اس کی بی بی اور سرائے کی نوکرانی وغیرہ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

''سرائے کے باہر'' اُردو کے ایک شاہکار ڈرامے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ چند بھکاریوں کی زندگی پر مبنی ایک سماجی ڈراما ہے۔ اس میں عورت کے استحصال کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ ڈراما سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کے تضاد کا بے لاگ اور بے رحم مرقع ہے۔ بقول احمد جلیس یہ ڈراما:

''ملک کی غیر منصفانہ معیشت پر ایک تیکھا طنز تھا۔ ہندوستان کو انہوں نے ایک ایسی سرائے سے تعبیر کیا تھا جس کے اندر چند کمروں میں ایک مخصوص سرمایہ دار طبقہ عیش و عشرت کر رہا ہے اور سرائے کے باہر ہندوستان کے لاکھوں کروڑوں ننگے بھوکے بھکاری ہیں جن میں شاعر، ادیب، موسیقار اور ہر طرح کے فن کار شامل ہیں۔'' (بحوالہ ماہنامہ آج کل، نئی دہلی، ڈراما نمبر، مئی ۱۹۹۴ء، جلد ۵۲، شمارہ ۱۰، مضمون: ریڈیائی ڈراما: ایک جائزہ، از رفعت سروش)

اس ڈرامے کے پلاٹ کو کرشن چندر نے حقیقت پسندانہ اسلوب میں پیش کیا ہے۔ ایک اندھا بھکاری، اس کی بیوی اور اس کی نوجوان بیٹی منی ایک پہاڑی قصبے میں رہتے ہیں جہاں سیلانیوں کے ٹھہرنے کے لیے ایک سرائے ہوتی ہے اور وہاں اکثر و بیشتر سرائے کے باہر بھکاری لوگ جمع ہوتے رہتے ہیں۔ سیلانی انھیں اپنا بچا ہوا کھانا اور کچھ روپیہ پیسہ دے دیتے ہیں۔ اسی بھیک پر منی، اس کے اندھے باپ اور بوڑھی ماں کی گزر بسر ہوتی ہے۔ جب سرائے کی مالکن سرائے کے دروازے پر نمودار ہو کر منی کو آواز دیتی ہے تو منی بھاگتی ہوئی اس کے پاس جاتی ہے۔ مالکن منی کو یہ کہہ کر کہ اسے وہ سرائے کے مالک سے اچھے اچھے کپڑے اور بہت ساری روٹی دلائے گی، اسے سرائے کے اندر لے جاتی ہے۔ منی چوں کہ بہت ہی معصوم ہے، اس لیے وہ اس چال کو سمجھ نہیں پاتی۔ منی کے اندر داخل ہوتے ہی سرائے کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ سرائے کی مالکن منی کی بھرپور جوانی سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کی غرض سے اسے سرائے میں آنے والے ایک شخص سے متعارف کرواتی ہے۔ وہ آدمی منی کو سبز باغ دکھا کر اس کی عصمت کو تار تار کر دیتا ہے۔ منی کو اس کا احساس نہیں ہوتا کیوں کہ اسے لذیذ کھانے، نئے نئے کپڑے اور ڈھیر سارے روپے مل گئے ہیں۔ اس حادثے سے منی کے اندھے باپ کی جو حالت ہوتی ہے، اس کی تصویرکشی ڈراما ''سرائے کے باہر'' کے درج ذیل اقتباس میں ملاحظہ ہو:

''اندھا: دروازہ کھول دو، سرائے کے بدمعاش کتو! دروازہ کھول دو، میری منی کو میرے حوالے کر دو......آہ! ظالم

شیطان کے جہنمی بیٹو! میری معصوم منی کو مجھے واپس دے دو۔اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔تم نے مجھ سے میرا گھر چھینا، میرے سنہرے کھیت چھینے، میرے خوب صورت بیلوں کی جوڑی، میری آنکھیں بھی تم نے مجھ سے چھین لیں۔اب میں اندھا ہوں۔ تمہارے دروازے کا بھکاری۔آہ! یہ دروازہ کھول دو (کھٹ کھٹ) کھول دو، ظالمو! ایک اندھے بھکاری پر رحم کرو، اس کے بڑھاپے کا سہارا، اس کی اندھی زندگی کی جوت اسے واپس دے دو۔ہاں میری منی مجھے واپس کردو۔اب میں تم سے کچھ نہیں مانگوں گا، چپ چاپ یہاں سے چلا جاؤں گا اور جنگل کے گیڈروں میں جا کر بسیرا کرلوں گا۔ چپ چاپ جاؤں گا، چپ چاپ (کھٹ کھٹ ہلکے ہلکے سسکیاں لیتا ہے)''

ڈراما ''سرائے کے باہر'' میں واقعات کو انتہائی موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔اس حوالے سے اس ڈرامے کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

''رات کے تین بج رہے ہیں، شاعر کو ایک آہٹ سنائی دیتی ہے۔منی نہ صرف بہترین کپڑوں میں ملبوس بلکہ شراب کے نشے میں بھی دھت ڈگمگاتے ہوئے قدموں کے ساتھ سرائے سے باہر نکلتی ہے، اس عالم میں وہ سبھی الفاظ اور وعدے دُہراتی ہے جو سرائے کے اندر شکاری نے اس کے جسم سے کھیلتے ہوئے اس سے کہے ہوتے ہیں۔ 'صرف چالیس روپے کے عوض؟' اس کی آواز سن کر سب جاگ جاتے ہیں۔ بھکاری اس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن شاعر اور جانی اسے چھڑاتے ہیں۔ اب منی ایک بار پھر وہ سب باتیں دُہراتی ہے جو سرائے کے اندر اس سے کہی گئی ہیں، پھر منی رونے لگتی ہے تو شاعر کہتا ہے...... رومت منی! ان خوشی کے آنسوؤں کو سنبھال کر رکھ...... ان آنسوؤں کو تو دوبارہ حاصل نہ کرسکے گی۔آج کی رات تو نے کیا کھویا ہے اور کیا پایا ہے۔یہ شاید تو اس وقت نہیں جان سکتی......تو اس ظالم سرائے کی پتھریلی دہلیز سے بیاہی گئی ہے کہ جس کے آستانے کی جبہ سائی کرتے کرتے تیرا باپ اندھا ہو چکا ہے۔رومت، منی! رونے کے لیے ساری عمر پڑی ہے۔ کل تجھے معلوم ہوگا کہ وہ قوس وقزح غائب ہو چکی ہے۔وہ سونے کا محل راکھ کا ڈھیر ہو گیا ہے۔''

شاعر منی کی باتیں سن کر کہتا ہے کہ تو نے ان جھوٹے وعدوں کے عوض آج وہ دولت کھوئی ہے جس کی قیمت اب تجھے عمر بھر چکانی ہوگی۔جانی لنگڑا شاعر کی باتیں سن کر نہ صرف اس کے دماغ خراب ہونے کی بات کرتا ہے بلکہ اسے وہاں سے فوراً چلے جانے کے لیے بھی کہتا ہے۔وہ نہیں چاہتا کہ شاعر منی کو سمجھانے کی کوشش کرے، چنانچہ شاعر چلا جاتا ہے۔ منی شاعر کو اسے بھی اپنے ساتھ لے جانے کے لیے کہتی ہے، لیکن شاعر ایسا کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیتا ہے کہ محبت کرنا یا زخمی زندگیوں پر پھاہا رکھنا اس کا کام نہیں۔وہ تو صرف دھرتی کے آنسو جمع کرتا ہے۔

یہاں اب کرشن چندر شاعر کی زبانی وہ باتیں کہلواتے ہیں جو نہ صرف بے پناہ تاثیر رکھتی ہیں بلکہ حقیقت کی عکاس بھی ہیں۔شاعر (جو خود ایک بھکاری ہے) منی کی کھوکھلی اور عارضی مسرت کا پردہ چاک کرتے ہوئے کہتا ہے:

''تیری بدنصیبی یہی ہے کہ تو نے ابدی مسرت کے چند لازوال لمحے اپنی پاک وصاف روح کی پہنائیوں سے نکال کر ایک ایسے آدمی کو بخش دیے جو ان کی قدر و قیمت نہیں جانتا۔ وہ لمحات جن کا جواب چاند اور سورج کی دنیاؤں کے پاس بھی نہیں، لیکن انسان ابھی انسان نہیں ہے۔وہ ہر اس چیز کو گزند پہنچاتا ہے جو خوبصورت ہے، مقدس ہے اور معصوم ہے اور ہر اس چیز کا پجاری ہے جو اس پر ظلم کرتی ہے، اس کی رُوح کچل کر اس کے نازک احساسات کے ٹکڑے ٹکڑے کرڈالتی ہے۔''

ڈرامے میں کرشن چندر نے ایک بھکاری خاندان کی زندگی کی بڑی موثر عکاسی کی ہے۔اس ڈرامے میں ایک شاعر کے ذریعے سُرخ انقلاب کی

بات بھی کہی گئی ہے جس میں اشترا کی نظریات کی واضح جھلک نظر آتی ہے۔اس ڈرامے میں سرائے امیر طبقے کی علامت ہے جسے ہر طرح کی آسائش اور سکون حاصل ہے جب کہ سرائے کے باہر مجبور اور بے بس انسان رہتے ہیں۔ ان دونوں طبقوں کے تناظر میں کرشن چندر نے امیری اور غریبی کے تضاد کو بڑی خوب صورتی سے بے نقاب کیا ہے۔

اس ڈرامے میں پلاٹ تسلسل کے ساتھ آگے بڑھتا ہے، لیکن بیچ میں ایسے مقامات بھی آتے ہیں جہاں کہانی تھوڑی دیر کے لیے رُک جاتی ہے اور ایک نئی کہانی شروع ہوتی ہے،مثلاً روٹی کا ذکر کرتے ہوئے اندھے بھکاری کا اپنے بیتے دنوں کو یاد کرنا، اپنے کسان ہونے اور چراگاہوں میں ریوڑ چرانے کی بات کرنا، بھکارن کا اپنی ماں کے برتاؤ کے بارے میں بتانا، گیدڑوں کے بارے میں لطیفہ سنانا اور شاعر کا اس پر بڑے طنزیہ انداز میں یہ کہنا کہ کیا اس راجا کے شہر میں بھکاری نہ تھے یا پھر بھکارن کا بسکٹ کھانے کے واقعے کو بیان کرنا؛ یہ سب وہ واقعات ہیں جو بہ ظاہر ڈرامے کے مرکزی پلاٹ کا حصہ نہیں ہیں تاہم وہ موضوع کی شدت کو اُبھارنے میں تعاون کرتے ہیں۔

اس ڈرامے میں آغاز، درمیان اور انجام تینوں اصولوں کو فنی سلیقے سے برتا گیا ہے۔کہانی سنٹر پوائنٹ پر اس وقت پہنچتی ہے جب منی سرائے کی دہلیز کو ہمیشہ کے لیے پار کر جاتی ہے اور یہی کہانی کا کلائمکس بھی ہے۔اس کے بعد کہانی خود بہ خود انجام کو پہنچ جاتی ہے۔کرشن چندر نے کرداروں کی تشکیل میں اس روایت کی پیروی نہیں کی ہے جس کے زیر اثر یہ ڈراما لکھا گیا ہے،مثلاً تمام کردار قوت سے محروم اور خود کو وقت کے دھارے پر چھوڑنے کے لیے مجبور نظر آتے ہیں۔ وہ نچلے طبقے کے نمائندے ضرور ہیں،لیکن ان میں ہمیں وہ زندگی نظر نہیں آتی جو ان کی حقیقی زندگی کا حصہ ہے،اسی لیے ڈرامے کے آخر میں شاعر ان کی طرف سے مایوس ہوکر کہتا ہے:

> ''سو گئے......سب سو گئے، اندھا،لنگڑا، بھکاری سب سو گئے۔ الاؤ کے تپتے ہوئے سرخ شعلے بھی جاگ جاگ کر سو گئے۔اب کالی برفیلی رات ہے اور ہواؤں کے تیز فراٹے،لیکن یہ فراٹے بھی سرائے کے منجمد سینے کو چیر نہیں سکتے۔جس طوفان کا تو منتظر ہے، وہ یہاں کبھی نہیں آئے گا۔اس لنگڑے کو اپنے ناسوروں سے محبت ہے،اس بھکاری کو اپنی بھوک سے اور تو......تو اپنی اس بے مصرف سارنگی کا بوجھ کاندھے پر اُٹھائے اس بجھتے ہوئے الاؤ کے کنارے کیوں بیٹھا ہے؟اُٹھ چل! پگڈنڈی کی پرانی راہ تجھے بلا رہی ہے۔تو راہی ہے، عاشق نہیں۔ تو مسافر ہے،محبت کرنے والا نہیں۔''

کرشن چندر نے اپنے ڈراموں میں نچلے طبقے کو موضوع بنایا ہے اور ان کی زندگی میں آئے دن پیش آنے والے واقعات کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا ہے جس میں ان کے نظریات بھی جھلکتے ہیں۔

کرشن چندر عموماً واقعات کو بیان کرتے ہوئے اپنے نظریے کو بھی پیش کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس ڈرامے میں وہ حقیقت نگاری کے ساتھ سرخ انقلاب کی بھی بات کرنے لگ جاتے ہیں جو معاصر زندگی میں حقیقت سے زیادہ ماورائی اور اسطوری محسوس ہوتا ہے۔

یہ ڈراما حقیقت پسند ڈراموں کی روایت کے عین مطابق ایک مقصدی ڈراما ہے جس میں کرشن چندر نے سماج کے مادّی نظام کو بھی نشانہ بنایا ہے اور یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ جب دولت چند ہاتھوں میں مرکوز ہوکر رہ جاتی ہے تو سماج کے دوسرے طبقوں خصوصاً نچلے طبقوں کا کیا حشر ہوتا ہے، پھر اس مہاجنی سماج میں کسی کی عزت وعصمت محفوظ نہیں رہتی بلکہ یہ نظام غریب کو مزید غریب اور امیر کو مزید امیر بناتا چلا جاتا ہے۔ کسان بھکاری بنتا ہے اور ساہوکار، بنک کار اور سماج کا ٹھیکیدار، یہ سب لٹیرے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ان تمام مسائل کو کرشن چندر نے اس ہنرمندی سے اُبھارا ہے کہ ہمیں کسی تصنع کا احساس تک نہیں ہوتا ہے۔

کرشن چندر کا ڈراما ''سرائے کے باہر'' ایک سماجی ڈراما بھی ہے۔کرشن چندر کا کہنا ہے کہ بھکاریوں کے ایک کنبے کے مسائل کو حل کرنا صرف کنبے کے افراد کی ہی ذمہ داری نہیں بلکہ یہ سماج کا بھی اہم فریضہ ہے۔ساتھ ہی کرشن چندر نے اس بات سے بھی آگاہ کیا ہے کہ ایسے سماجی نظام یعنی جنگل میں صرف وہی جان دار رہ سکتے ہیں جو اپنی حفاظت آپ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ وہاں صرف بہتر اور

برتر ہی زندہ رہ سکتا ہے اور کمزور کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ڈاکٹر ظہورالدین نے لکھا ہے کہ:

''یہ ڈراما بھی اس مسلسل جدوجہد کو پیش کرتا ہے کہ جو خود کو زندہ رکھنے کے لیے ہرانسان کرتا ہے، منی کا بار بار کھڑکی کی طرف جانا، بی بی سے گالیاں کھانا، ماں باپ کا روٹی کے لیے اس سے بار بار تقاضا کرنا اسی جدوجہد کے علامیے ہیں۔ اس جدوجہد میں انسان اکثر بھاری قیمت چکاتا ہے اور اکثر وبیشتر بھاری قیمت چکانے کے باوجود وہ اپنی منزل تک نہیں پہنچتا، یہاں بھی کرشن چندر اسی حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں جس میں آگ کو بجھانے کے لیے منی سرائے کی دہلیز کو پار کرتی ہے اور کئی اور چنگاریوں کو بھڑکانے کا موجب بنتی ہے یعنی اس کا یہ عمل نئی جدوجہد کے آغاز کے امکانات پیدا کرتا ہے، نئے مسائل کھڑے کرتا ہے کہ جن سے اب منی کو تنہا نبردآزما ہونا ہے۔'' (حقیقت نگاری اور اُردو ڈراما، ص۲۷۵ و ص۲۷۶، شعبہ اُردو، جموں یونیورسٹی، ۱۹۸۴ء)

ڈرامے کے سبھی کردار جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، کرشن چندر نے اس کی سچی تصویر پیش کر دی ہے، لیکن کہیں کہیں ان کے کرداروں میں زندگی کی موثر عکاسی نہیں ملتی، مثلاً شاعر کہ جس کے وجود میں حقیقی زندگی کی آگ کی چنگاریاں بھڑکانے کے امکانات زیادہ تھے، کرشن چندر نے اسے محض تماشائی بنا کر رکھ دیا ہے۔ بھکاری اور شاعر دونوں خوابوں کی دنیا میں رہنے والے انسان ہیں، جب کہ بھکارن اور لنگڑا خالص عملی کردار نظر آتے ہیں۔ منی نہایت معصوم اور زندگی کی اونچ نیچ سے بالکل بے خبر ہے، اسی لیے وہ گاؤں کے جنگل سے تو گھبراتی ہے، لیکن سرائے کی اونچی دیواروں کے اندر سائیں سائیں کرتے ہوئے بھیانک جنگل کو نہیں دیکھ پاتی۔ شاعر اس ڈرامے کا ہیرو ہے اور منی ہیروئن۔ شاعر تجربہ کار ہوتے ہوئے بھی بے عملی کا شکار ہے اور منی ناتجربہ کاری کی وجہ سے جنگل کی ہوس کا شکار ہو جاتی ہے۔

کرشن چندر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ شاعرانہ زبان استعمال کرتے ہیں جس میں سلاست وروانی کے ساتھ ساتھ رنگینی پائی جاتی ہے، لیکن اس ڈرامے میں انھوں نے عام بول چال کی زبان استعمال کی ہے اور اسلوب بھی سادہ اور دلکش ہے۔ کہیں کہیں فلسفیانہ گفتگو نظر آتی ہے جس سے ابہام پیدا ہو گیا ہے، لیکن مجموعی طور پر:

''ڈرامے کی خیالی سطح کافی بلند ہے۔ ان میں بہت زیادہ ڈرامائیت موجود ہے۔ کردار نہایت موزوں ہیں۔ شاعر بے حد متاثر کرتا ہے......مکالموں کی برجستگی نے ڈرامے میں جان ڈال دی ہے۔ حرکت وعمل کی گنجائش بھرپور ہے۔ زبان فطری اور عام فہم ہے۔ ڈرامہ حسن تاثر سے مالا مال ہے۔'' (حقیقت نگاری اور اُردو ڈراما، ص۲۷۴ و ص۲۷۵)

ان ہی خوبیوں کی بنیاد پر ڈراما 'سرائے کے باہر' ریڈیو ڈرامے کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ پروفیسر قمر رئیس نے اس ڈرامے پر اپنی تنقیدی رائے پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سرائے کے باہر' سرمایہ دارانہ نظام زندگی کے تضاد کا بے لاگ اور بے رحم مرقع ہے جو اُردو کے مختصر ڈراموں میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ کرشن چندر دلچسپ تیکھے مکالموں اور کہیں کہیں طنز وظرافت کی چاشنی سے ڈرامے میں ایسی فضا پیدا کر دیتے ہیں کہ قاری کی دلچسپی ایک لمحہ کے لیے کم نہیں ہوتی۔''

(اُردو ڈرامہ، سرسید بک ڈپو، علی گڑھ، ۱۹۶۱ء)

❀❀❀

خریدار اور کرم فرما حضرات سے......

''زبان و ادب'' کی تازہ اشاعتیں، خریدار اور کرم فرما حضرات کے پتہ پر بروقت بھیج دی جاتی ہیں۔ پرچہ سادہ ڈاک سے روانہ کیا جاتا ہے۔ پرچہ کے تاخیر سے ملنے یا نہیں پہنچنے کی صورت میں، اپنے علاقہ کے ڈاکیہ اور مقامی ڈاک خانے سے رجوع کریں۔ ادارہ ڈاک میں پرچہ کی گم شدگی کا ذمہ دار نہیں۔

سیفی سرونجی
"Intesab Aalami" Quarterly, Saifi Library, Sironj - 464228 (Mob. 9425641777)

مشرقی تہذیب کا سچا عاشق: اکبرالہ آبادی

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعری جس کا نام کرتی ہے اُس کو عالی مقام کرتی ہے۔ جہاں ایک طرف شاعری دلی جذبات اور احساسات کے اظہار کا نام ہے، وہیں دوسری طرف شاعری سے کوئی بڑا کام بھی لیا جاسکتا ہے۔ تاریخ اِس بات کی گواہ ہے کہ شاعری نے کئی انقلاب برپا کیے ہیں۔ شاعری بڑے مقصد کے لیے بھی کی جاسکتی ہے۔

اردو میں کئی بڑے شاعر ہوئے ہیں، جنھوں نے شاعری سے ایک انقلاب برپا کیا اور قوم کی اصلاح کے لیے اپنی زندگی وقف کردی، اُن میں علامہ اقبالؔ اور اکبرالہ آبادی کا نام سب سے نمایاں ہے۔ اکبرالہ آبادی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے طنز ومزاح کے ذریعے قوم کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا اور مغربی تہذیب کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکا۔

بات سنجیدہ لہجے میں کہی جائے تو دل پر ضرور اثر کرتی ہے، لیکن بسا اوقات آدمی خود کا محاسبہ نہیں کر پاتا، البتہ، لیکن مذاق مذاق میں آدمی کے دل پر جو کچوکے لگائے جاتے ہیں وہ اُسے جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں اور ہر شخص اپنا محاسبہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اکبرالہ آبادی نے اپنی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری سے یہی احساس دلایا ہے۔ اُن کی شاعری میں ایک مقصد تھا۔ وہ مغربی تہذیب کے سخت خلاف تھے اور بے پردگی اور مخلوط تعلیم کے بھی خلاف تھے۔ اُن کے برعکس سر سید احمد خاں نے نئی تعلیم کو ضروری قرار دیا۔ اس لیے اکبرالہ آبادی علی گڑھ تحریک کے بھی خلاف رہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

> ''اکبر پہلے شخص تھے جن کو بدلتے ہوئے زمانے، اس زمانے میں اپنی تہذیبی قدروں کے لیے خطرہ اور انگریزی تعلیم وترقی کو انگریزی سامراج کے قوت مند شار ہونے کا احساس شدت سے تھا تو انھوں نے اس کے مضمرات کو بہت پہلے دیکھ لیا تھا۔ اِس معاملے میں گاندھی اور اقبالؔ بھی ان کے بعد ہیں۔ انھوں نے سرمایہ داری اور نوآبادیاتی نظام میں مضمر کئی خطرات کو محسوس کر لیا تھا، وہ رسماً انگریزی کے مخالف نہیں تھے۔''

اکبرالہ آبادی نے مغربی تہذیب وتعلیم کی اتنی شدت سے مخالفت کی کہ بہت سے لوگ اُن سے اختلاف رکھنے لگے۔ مغربی تہذیب سے وہ اتنے نالاں تھے کہ انگریزی تعلیم کو بھی اہمیت نہ دی، جب کہ ترقی کا کوئی راستہ انگریزی کے بغیر نہ کل ممکن تھا، نہ آج ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکبرالہ آبادی کی باتوں کو اور اُن کی شاعری کو بھی لوگ مذاق میں ہی لیتے رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مزاحیہ شاعری میں اُن کا کوئی جواب ہی نہیں ہے۔ ایسے بہت سے شعر اور غزلیں موجود ہیں جن میں کوئی طنز نہیں، مگر انہیں پڑھ کر لوگ بجائے سنجیدہ ہونے کے لطف اُٹھاتے تھے، مثلاً ؎

مکے تک ریل کا سامان ہوا جاتا ہے
اب تو انجن بھی مسلمان ہوا جاتا ہے

بیوی کی حکومت لاحول ولا قوۃ
شوہر کی یہ ذلت لاحول ولا قوۃ

اکبر دراصل انگریزوں سے متنفر نہیں تھے، بلکہ وہ اسلامی نظریات کے حامی تھے۔ چونکہ انگریز اپنی تہذیب زبردستی تھوپ رہے تھے، اس لئے حالات کے تناظر میں انہوں نے نہایت شدومد سے اس کے خلاف آواز بلند کی۔ اِس سلسلے میں ڈاکٹر فخر الکریم صدیقی لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان میں جس قسم کا تعلیمی نظام انگریزوں نے رائج کیا اُس کا مقصد ایک ہی تھا، ہندوستان میں حکومت برطانیہ کا استحکام اور بقا، جس کے لیے تعلیمی ادارے سب سے مفید اور کارگر ہو سکتے تھے۔ اِس نظامِ تعلیم نے

چند برسوں میں لوگوں کے اذہان بدل کر رکھ دیے۔
انگریزی زبان اور مغربی علوم کی اس چکا چوند میں ہمیں
خود بصارت پر اعتماد نہ رہا۔ ہمارے سوچ وفکر کا دھارا ہی
تبدیل ہو گیا۔۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے نے ہندوستانیوں
کے لیے ایک نیا نظامِ تعلیم مرتب کیا اور انگریزی زبان کو
نہ صرف ذریعہ تعلیم بلکہ عوامی رابطے کی زبان بنانے کی
تجویز پیش کی۔اُس کا مقصد ملک میں ایسا گروہ پیدا کرنا
تھا جو انگریزی تہذیب ومعاشرت کی تقلید کرے۔''

انگریز اُس وقت پورے ملک میں اپنا تسلط قائم کر چکے تھے۔ ہر طرف ظلم و ستم اور انتشار پھیلا ہوا تھا۔ اکبرالہ آبادی یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ بھلا ایک خوددار شاعر اپنی تہذیب کی دھجیاں اُڑتے ہوئے کیسے دیکھ سکتا تھا؟ اکبر نے اپنی شاعری سے مزاحیہ اور طنزیہ انداز میں صدائے احتجاج بلند کیا۔ کئی نظمیں اور اشعار موجود ہیں جن میں اُنھوں نے مغربی تہذیب کا مذاق بھی اڑایا ہے اور اپنی قوم کو بیدار بھی کیا ہے۔ انگریز تعلیمی اداروں سے لے کر دیگر دفتروں اور جلسوں ، مذاکروں کے ذریعے عیسائیت کو فروغ دینے میں کوشاں تھے۔ اکبرالہ آبادی کو اسلام خطرے میں نظر آیا، کیونکہ لوگ جوق در جوق مغربی تہذیب میں ڈوبتے جا رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اِس بڑھتے ہوئے رجحان اور مغربی تہذیب کے شیدائیوں سے، ملک کے نوجوانوں سے یوں خطاب کیا ؎

خدا کے واسطے اے نوجوانو ہوش میں آؤ
دلوں میں اپنے غیرت کو جگا دو جوش میں آؤ

نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے
جناب ڈارون کو حضرت آدم سے کیا نسبت

حاصل کرو ، علم طبع کو تیز کرو
باتیں جو بری ہیں اُن سے پرہیز کرو

یہ موجودہ طریقے راہی ملک عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے

اکبرالہ آبادی نے عورتوں کی تعلیم کو بھی زیادہ اہمیت نہیں دی۔اسکولی تعلیم میں لڑکے لڑکیوں کا ساتھ پڑھنا اُن کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔اُنھیں خطرہ تھا کہ اِس سے عیاشیاں بڑھیں گی، بے شرمی، بے حیائی کا چلن عام ہو جائے گا، عورت کی عزت محفوظ نہ رہ سکے گی، اس لیے انھوں نے مخلوط تعلیم کو یوں نشانہ بنایا ؎

اپنی اسکولی بہو پر ناز ہے اُن کو بہت
ہال میں ناچے گی کسی دن اُن کی پوتی تو سہی

گھر سے پڑھ لکھ کے نکلیں گی کنواری لڑکیاں
باہنر ، باعلم ، خوش اور ساختہ پرداختہ

مغربی تہذیب آگے بڑھ کے جو حالت دکھائے
نوجواں دکھلائی دیں گے ہر طرف دِل باختہ

اکبرالہ آبادی نے ایسے ایسے نامانوس الفاظ سے مزاح کی چاشنی پیدا کی ہے کہ کوئی دوسرا اُن کا ہمسر نہیں، مثلاً ٹٹو، اونٹ، بھینس، گائے، ریل گاڑی، بدھو جیسے الفاظ سے ظرافت کے کئی رنگ بھر دیے ہیں۔ جتنا اکبرالہ آبادی نے مغربی تہذیب کا مذاق اُڑایا ہے، اُتنا کسی نے نہیں اُڑایا۔ اکبر کے نظریات اور خیالات سے اکثر لوگ متفق نہیں تھے، اس لیے کہ تعلیم نسواں کو وہ عیب سمجھتے تھے، حالاں کہ وہ اسلامی نظریات کے حامی تھے۔اسلام نے عورتوں کی تعلیم پر بھی زور دیا ہے۔ اکبرالہ آبادی کے مخالفین کی تعداد کافی تھی، حالانکہ وہ ایک سچے مسلمان تھے اور ایمان کی سلامتی کے لیے فکر مند رہتے تھے۔اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ نئی روشنی، نئے فیشن اور اسلام بیزار مغربی تہذیب کو وہ ہمہ دم اور ہمہ صورت طنز کا نشانہ بناتے تھے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''ہندوستان و پاکستان کے نقاد اِس حد تک تو متفق
نظر آتے ہیں کہ اکبر مشاہدے کی قوت رکھتے تھے۔
شاعرانہ انداز میں اُنھوں نے اپنے زمانے کی معاشرت
کی نہایت دیانت داری سے ترجمانی کی ہے۔اُن کے
کلام میں مسلمانانِ ہند کی اخلاقی قدروں ،حکومت کی
چیرہ دستیوں، قومی پریشانیوں ،تہذیبی انحطاط اور قدیم و

(بقیہ ص ۴۴ پر)

ڈاکٹر آفتاب عالم
"Haji Jamaluddin Library" Vill+Post Nauranga Distt- Gaya-823003 (Mob.8986082787)

بدؔر اورنگ آبادی کی نثری خدمات

بدؔر اورنگ آبادی کا نام اردو دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ ان کی پیدائش یکم جنوری ۱۹۲۷ء کو بہار کے شہر اورنگ آباد میں ہوئی اور یہیں ۷ رستمبر ۲۰۲۳ء کو انہوں نے آخری سانس لی اور گیا کے کریم گنج قبرستان میں مدفون ہوئے۔

بدؔر اورنگ آبادی نے ابتدائی حاصل کرنے کے بعد پٹنہ یونیورسیٹی سے بی اے میں اول مقام حاصل کیا اور انہیں گولڈ میڈل سے بھی نوازا گیا۔ دورانِ ملازمت ان کا قیام کلکتہ، رانچی، اندر پوری (روہتاس) اور پٹنہ میں رہا۔ وہ رانچی اور پھر پٹنہ کے اے جی بہار میں اکاؤنٹس افسر رہے اور مگدھ یونیورسیٹی سے فنانشیل ایڈوائزر کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے اور سبکدوشی کے بعد گیا شہر میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

بدؔر اورنگ آبادی اگرچہ شاعر کی حیثیت سے بھی معروف زمانہ ہیں، لیکن اس مضمون میں، صرف ان کی نثری خدمات تک میں اپنی گفتگو محدود رکھنا چاہتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تنقید نگار، صحافی، شاعر اور مبصر کی حیثیتوں سے اردو ادب کی تاریخ میں اپنا نام درج کرا چکے ہیں، لیکن فن افسانہ نگاری میں بطور خاص انہیں جو اعتبار و وقار حاصل ہے۔ وہ ارباب فن سے مخفی نہیں۔

افسانہ رقم کرتے ہوئے انداز بیان کی دلکشی کے علاوہ بدؔر اورنگ آبادی کا قلم ایک ایسی خوبی بھی رکھتا تھا جس کی کمی آج بہت زیادہ محسوس کی جانے لگی ہے۔ افسانے تو بہت لکھے جا رہے ہیں، سماج کی ترجمانی کرنے میں بہتوں کو آج بھی فوقیت حاصل ہے، تکڑم بازی کی بنیاد پر وہ پذیرائی بھی پا رہے ہیں، مگر حقیقت یہی ہے کہ جس طریقے سے لفظوں کا استعمال اپنے افسانوں میں بدؔر اورنگ آبادی نے کیا ہے، اس طریقے سے کم قلمکار اپنے قلم کا استعمال کرتے ہیں۔

بے غرضی کے دور میں مطلب پرستوں کا ہجوم قدروں کو خاک کر ڈالتا ہے، اس بات کا شدید احساس بدؔر اورنگ آبادی کو رہا ہے۔ ان کے افسانوں میں انسان سے انسانیت کی بنیاد پر جذباتی رشتہ قائم رکھنے کا جذبہ لائق ستائش ہے۔ بدؔر اورنگ آبادی کے پہلے افسانوی مجموعہ ''لالچی'' پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد نظام صدیقی نے آل انڈیا ریڈیو کے اردو پروگرام میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا:

> ''بدؔر اورنگ آبادی کی ذات واقعتاً اس حقیقی تخلیقی صلاحیت سے بہرور ہے جو صاحب احساس و شعور ادیبوں کے علاوہ اور کسی میں نہیں پائی جاتی اور جس کے عطا کرنے میں قدرت نہایت بخیل واقع ہوئی ہے۔ اسی کے دوش بدوش ان کے اسلوب نگارش میں وہ ابلاغی توانائی بھی کارفرما ہے جو ان کے دماغ کی آتش خلاقی کو قارئین کے دوران خون میں آسانی سے منتقل کر سکتی ہے، لیکن وہ اپنی عدیم الفرصتی اور دیگر خارجی اور داخلی مجبوری کے باعث اس کو درجہ کمال تک نہیں پہنچا سکے۔''

نظام صدیقی جیسے قد آور نقاد نے بدر اورنگ آبادی کے افسانہ ''لالچی'' کو صف اول کے افسانہ نگاروں کے افسانوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے تو اس میں کچھ بھی مبالغہ نہیں۔ بلاشبہ افسانہ ''لالچی'' کو اس کی بنت، اسلوب، ہیئت اور نفسیاتی کشمکش نے جو معیار اور آفاقیت بخشی ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس افسانہ کا مرکزی کردار کیلاش کے والدین ہیں جو دور جدید کے علمبردار ہیں۔ یہاں باپ اپنی بیگم کی جوانی برقرار رکھنے کے لئے بچے کو مامتا کے سوتے اور گود کی بجائے بے بی فوڈ اور آیا کی گود کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس کا نفسیاتی اثر یہ بنتا ہے کہ کیلاش کی جب شادی ہوتی ہے تو وہ اپنی پتنی پرمیلا سے ماماتا کا متلاشی رہتا ہے۔ اس نفسیاتی کشمکش کو ڈائری کے اوراق اور چند خطوط کے سہارے افسانہ نگار نے

جس خوش اسلوبی اور فنی کارفرمائی کے ساتھ بیان کیا ہے، ساتھ ہی ساتھ فیشن زدگی سے چھن رہی ممتا پر فکرمندی کا جس طرح اظہار کیا ہے وہ یقیناً اس افسانہ کو لازوال بنادیتا ہے۔

بدؔر اورنگ آبادی کے اس افسانہ پر پروفیسر وہاب اشرفی نے اظہار خیال کرتے ہوئے اپنی جو رائے پیش کی ہے، وہ بدؔر اورنگ آبادی کی فنکارانہ عظمت کا کھلا اعتراف ہے۔ وہاب اشرفی کے خیال کے بموجب افسانہ ''لالچی'' Initiation کی کہانی ہے۔ نفسیات کی اصطلاح مستعار لی جائے تو اس میں Oral Fixation کا نظریہ ملے گا۔ ایک بچہ کی نفسیات سن بلوغ میں کس طرح جڑ پکڑتی ہے، اس کا اظہار اس افسانہ میں انتہائی فنکارانہ طور پر ہوا ہے۔ اردو میں Initiation کے افسانے بہت کم لکھے گئے ہیں، ایسی صورت میں بدؔر اورنگ آبادی کا یہ افسانہ یقیناً بڑے انفراد کا حامل ہے اور یہ بھی کہنے کی ضرورت نہیں کہ نظام صدیقی اور پروفیسر وہاب اشرفی نے اس افسانہ سے متعلق جو رائے قائم کی ہے ان میں کافی حد تک یکسانیت ہے۔ ''لالچی'' سے متعلق نامور نقاد پروفیسر عبدالمغنی نے لکھا ہے:

> ''مصنف نے نہ صرف اپنے گرد و پیش کی دھڑکتی ہوئی حیات کا مطالعہ و مشاہدہ کیا ہے، بلکہ اسے انسانیت کے درد و داغ اور جستجو و آرزو کا بڑا گہرا احساس بھی ہے۔ وہ اپنے کرداروں کی الجھنوں اور مشکلات کے ساتھ پوری ہمدردی رکھتا ہے۔'' (پروفیسر عبدالمغنی 'لالچی' کے فلیپ سے)

بدؔر اورنگ آبادی کے افسانوی مجموعہ ''لالچی'' کی اشاعت کے بعد اُن کے دو اور افسانوی مجموعے ''رگِ سنگ'' (۱۹۸۳ء) اور ''اگر روشنی نہ ہوتی'' (۲۰۰۳) بھی شائع ہوئے اور ادبی دنیا میں کافی پسند کئے گئے۔ ان کے علاوہ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''افکارِ منتشر'' ۱۹۸۱ء میں اور شعری مجموعہ ''خوابِ آرزو'' ۱۹۹۹ء میں منظر عام پر آیا، مزید برآں: ہندی سے اردو سیکھنے کا قاعدہ بنام ''اردو سیکھیں'' اور ہفتہ وار ''مورچہ'' کے کالم پر مبنی کتاب ''دروغ گوئیاں'' میں اشاعت پاکر مقبول ہوئیں۔ ان میں سے اوّل الذکر کتاب ۱۹۸۰ء میں اور ثانی الذکر کتاب ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔

بدؔر اورنگ آبادی کی افسانہ نگاری نصف صدی سے زیادہ مدت کا احاطہ کرتی ہے۔ ان کا پہلا افسانہ دہلی سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''جمالستان'' کے مئی ۱۹۴۲ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ اس افسانہ کا عنوان کیا تھا؟ موضوع کیا تھا؟ اسلوب کیا تھا؟ ان کی نشاندہی نہیں ملتی ہے، اس لئے کہ وہ افسانہ دستیاب نہیں ہے۔ بدؔر صاحب کے افسانے ۱۹۴۴ء سے ملتے ہیں جو ان کے پہلے افسانوی مجموعہ ''لالچی'' میں شامل ہیں۔ یہ پہلا افسانوی مجموعہ ۱۹۷۵ء میں گیا ضلع انجمن ترقی اردو گیا کے زیر اہتمام شائع کیا گیا تھا۔ اس مجموعہ میں کل دس افسانے ہیں۔ جن کے عنوانات اور سن اشاعت اس طرح درج ہیں:

''آرٹسٹ کون''، ''تصویر کے دو رخ'' (۱۹۴۴ء)
''چتا''، ''الجھن'' (۱۹۴۵ء)
''دھرتی کی بیٹی''، ''سیڑھی'' (۱۹۴۶ء)
''کھیل ہی کھیل میں''، ''کارواں'' اور ''تبدیلی'' (۱۹۴۷ء)
''لالچی'' (۱۹۶۷ء)

ان تمام افسانوں سے متعلق خود افسانہ نگار کی رائے کیا ہے، اس کا اظہار بدؔر اورنگ آبادی نے اپنے پہلے افسانوی مجموعہ ''لالچی'' کے مقدمہ میں ''میں بھی کچھ کہنا چاہوں گا'' کے تحت اس انداز سے کیا ہے:

> ''آپ جو افسانے پڑھیں گے وہ اس زمانہ میں لکھے گئے تھے، جب وہ حادثات نہ ہوتے تھے جو آج ہوتے ہیں، وہ Tension نہیں تھا جو آج ہے، زندگی کی وہ قدریں نہیں تھیں، جو آج ہیں، سوچنے کا وہ انداز نہیں تھا جو آج ہے اور سب سے بڑی بات کہ خود میں وہ نہیں تھا جو آج ہوں۔ یہ وہ دن تھے جب میں آزاد اور اسیر فضا کی سرحدوں پر تھا۔ افسانے پڑھنے کا شوق تھا اور کچھ سوچتے رہنے سودا تھا سر میں۔ کبھی کوئی بہت ہی چھوٹا اور غیر اہم واقعہ مجھے بیحد متاثر کر دیتا اور کبھی کوئی بڑا حادثہ بھی میرے دل پر کوئی نقش نہیں چھوڑتا اور جب کبھی کسی تاثر کے تحت ایک بے چینی سی محسوس کرنے لگتا تو لکھنے بیٹھ جاتا اور جو بھی واقعہ یا سانحہ جس ڈھنگ اور تسلسل سے میرے دل و ذہن کو متاثر کرتا میں وہ واقعہ اسی تسلسل سے

قلم بند کر دیتا اور میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا، بے کلی دور ہو جاتی۔ یہ مقصد تھا میری افسانہ نگاری کا......ممکن ہے آپ یہ سوچیں کہ پچیس، تیس سال کے بعد ان افسانوں کو اکٹھا کرنے کا مقصد کیا ہے؟ ضروری ہے کہ ہر کام میں کوئی نہ کوئی مقصد پوشیدہ ہو ہی؟ کیا کبھی آپ ایسا کوئی کام نہ کر بیٹھے ہیں جس کے بارے میں آپ نے کبھی سوچا بھی نہ ہو؟ یہ مجموعہ افسانہ بھی بس اسی قسم کا ایک حادثہ ہے جس کی تمام تر ذمہ داری میرے عزیز بیٹے سید احمد قادری اور اراکین ادبی مجلس اورنگ آباد کے سر ہے۔ ایک بار میرے بیٹے نے فرمائش کی تھی کہ میں کچھ کروں کہ اس کے پاس میری کوئی مستقل نشانی رہ جاتی۔ میں کیا دیتا اپنے بیٹے کو؟ کچھ بھی تو نہیں تھا میرے پاس! اسی فرمائش کی تعمیل میں یہ نشانی چھوڑ رہا ہوں اور کچھ ہی دنوں پہلے میرے کرم فرما جناب کلام حیدری نے کہا تھا کہ زندگی سے بدلہ لینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انسان کچھ تخلیق کرے اور میں اب بالکل مطمئن ہوں کہ میں نے زندگی سے بدلہ لے لیا۔'' (افسانوی مجموعہ ''لالچی'' ص ۹ وص ۱۱)

افسانوں کے حوالے سے پروفیسر عبدالمغنی، پروفیسر وہاب اشرفی، کلام حیدری، ڈاکٹر افصح ظفر، نظام صدیقی، حسین الحق، رضوان احمد، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر قاسم فریدی، سید ظفر ہاشمی، عبدالرافع، عشرت ظہیر، ڈاکٹر قیام نیر اور خورشید حیات وغیرہ نے بدؔر اورنگ آبادی کو اگر اہم، منفرد اور قابل قدر افسانہ نگار تسلیم کیا ہے اور ان کے نفسیاتی افسانوں کو غلام عباس، ضمیر احمد، راجندر سنگھ بیدی اور احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کی صف میں شمار کیا گیا ہے تو یقیناً اس میں کچھ حیرت کی بات نہیں۔ یقیناً وہ اس قدر دانی کے مستحق تھے۔

بدؔر اورنگ آبادی انواع ادب کی اس تثلیث کے فنکار تھے، جس کا ایک زاویہ ''افسانہ'' سے عبارت ہے، دوسرا ''تنقید'' سے اور ''تیسرا'' شاعری سے اور حقیقت یہ ہے کہ صرف افسانہ نگاری ہی نہیں، ان کی تنقید نگاری بھی بہت جاندار ہے۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے ''بدر اورنگ آبادی کا نظریہ اصول نقد'' کے عنوان سے برسوں پہلے ایک بہت ہی وقیع مضمون لکھا تھا جو رریہ سے شائع ہونے والا ادبی ماہنامہ ''ابجد'' کے پہلے شمارہ میں چھپا تھا۔ اس مضمون کا مطالعہ ان کے تنقیدی وژن کو آئینہ کر دینے میں پوری طرح کامیاب ہے۔

بدؔر اورنگ آبادی ایک بلند نظر صحافی بھی تھے۔ گرچہ سرکاری ملازمت کے باعث انہوں نے کئی فرضی ناموں سے لکھا، مگر خوب لکھا اور اس طرح ملک کے مختلف اخبارات مثلاً ''دعوت''، ''بلٹز''، ''پندار''، ''قومی تنظیم''، ''مورچہ''، ''فاروقی تنظیم''، ''کوہسار جرنل''، ''ہندوستان ٹائمز''، ''ٹائمس آف انڈیا''، ''ٹیلی گراف''، ''انڈین نیشن''، ''سرچ لائٹ''، ''ریڈینس'' وغیرہ کی وساطت سے سیاسی، سماجی، اقتصادی، معاشرتی اور تعلیمی مسائل پر اپنی بے باک تحریر سے قارئین کی توجہ مبذول کرانے میں کامیاب ہوئے۔ انہیں باضابطہ ادبی وصحافتی دنیا میں لانے کا سہرا کلام حیدری کے سر جاتا ہے۔ انہوں نے ہی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ''مورچہ'' کے صفحات ان کے لئے وقف کر دیے تھے کہ آپ جو چاہیں لکھیں اور انھوں نے یہ کام بخوبی انجام دیا۔

بدؔر اورنگ آبادی ایک سچے دانشور فنکار تھے۔ نہ صرف ان کی شاعری بلکہ ان کی نثری خدمتیں بھی اس کی شہادت دیتی ہیں کہ انہوں نے اپنی منصبی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے ادب کی بڑی خدمت کی اور اسی کی بدولت اپنی زندگی میں کئی اعزازات سے بھی سرفراز ہوئے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بدؔر اورنگ آبادی ہمارے اُن فنکاروں میں ہیں جو اپنی ایک زندہ یادگار بھی چھوڑ گئے۔ میرا اشارہ ان کے صاحبزادے ڈاکٹر سید احمد قادری کی طرف ہے، جن کی ادبی شخصیت سے ایک زمانہ واقف ہے۔ بدؔر اورنگ آبادی کے رخصت ہو جانے کے بعد ان کے قیمتی ادبی اثاثہ کو دیکھتے ہوئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان پر تحقیقی کام ہو اور اگر ایسا ہو سکا تو یقیناً اس سے اردو ادب وصحافت کی دنیا وسیع ہوگی۔

❁ ❁ ❁

ڈاکٹر محمد ثاقب انور

Sarweli, Post. Baraidgah, Via. Kasba, Purnia - 854330 (Mob. 9801261623)

بیدی کے ببل پر ایک نظر

ترقی پسند تحریک کی بدولت ملنے والے افسانوی تحائف ہی کیا، اردو کے تمام تر افسانوی ادب میں راجندر سنگھ بیدی کی فکشن خدمات چمکتے سورج کی طرح روشن ہیں۔ بلاشبہ ڈاکٹر گیان چند جین کے لفظوں میں اردو افسانے کے چار اہم ستون میں سے ایک ستون کا نام بیدی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی اپنی کہانیوں کی بدولت انسانی نفسیات کے بہت بڑے نباض اور ترقی پسند تحریک کے بہت ہی جذباتی افسانہ نگار کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیتے ہیں، کیونکہ انہوں نے جس قدر فنی نزاکت، خوبصورتی، تہداری اور معنویت کے ساتھ، انسانوں کی جبلی معصومیت کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے، وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ترقی پسند ادیبوں میں، اپنے مسلک پر قائم رہتے ہوئے جو چند افسانہ نویس، توازن اور اعتدال کا دامن ہمیشہ مضبوطی سے تھامے رہے، ان میں راجندر سنگھ بیدی کا مرتبہ بہت ہی بلند ہے۔

بیدی اردو کے ان افسانہ نگاروں میں ہیں جو تقسیم وطن سے پہلے ہی شہرت کی بلندیوں پر پہنچ چکے تھے۔ بیدی ۱۹۱۵ء میں پیدا ہوئے اور بظاہر ۱۹۸۴ء میں اس دنیا سے چل بسے، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے فن کی بدولت آج بھی زندہ ہیں۔ بیدؔی نے یوں تو مزاحیہ مضامین، ڈرامے اور ناولٹ بھی لکھا، لیکن ان کی اصل شہرت اور اصل ادبی شناخت ان کے افسانوں سے ہی دائم وقائم ہے۔ بیدی کا پہلا افسانہ ''مہارانی کا تحفہ'' ہے جو ۱۹۳۱ء میں ''ادبی دنیا'' لاہور میں شائع ہوا تھا۔ آزادی سے پہلے بیدی کے دو افسانوی مجموعے ''دانہ ودام'' (۱۹۳۶ء) اور ''گرہن'' (۱۹۴۲ء) منظر عام پر آئے۔ بیدؔی کی دو مشہور کہانی ''بھولا'' اور ''گرم کوٹ'' ان کے پہلے افسانوی مجموعے میں اور ان کی دو مشہور تخلیق ''گرہن'' اور ''رحمٰن کے جوتے'' ان کے دوسرے افسانوی مجموعے میں شامل ہے۔

آزادی کے بعد ۱۹۴۹ء میں بیدی کی کہانیوں کا مجموعہ ''کوکھ جلی'' اور ۱۹۶۵ء میں نو کہانیوں پر مشتمل ان کا افسانوی مجموعہ ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' شائع ہوا، جس کا انتساب مشہور نقاد آل احمد سرور کے نام ہے۔ اس مجموعے کی پہلی کہانی ''لاجونتی'' اور آخری کہانی ''یوکلپٹس'' ہے۔ اس میں ٹائیٹل کہانی سے پہلے ''لاجونتی'' کے بعد ''جوگیا''، ''ببل'' اور ''لمبی لڑکی'' کو جگہ ملی ہے، جب کہ ٹائٹل کہانی کے بعد ''ٹرمینس سے پرے''، ''حجام الہ آباد کے''، ''دیوالیہ'' اور یوکلپٹس'' کو جگہ دی گئی ہے۔ ان کہانیوں میں مختلف زاویے سے بیدی نے ان تمام انسانی آلام ومصائب، پریشانیوں، الجھنوں، تمناؤں اور قربانیوں کو اپنا موضوع بنایا ہے جن سے آئے دن ہر شخص اور ہر معاشرہ کسی نہ کسی انداز میں نبردآزما ہوتا رہتا ہے۔ انسانی جبلت کی سادگی کو دیکھنا اور دکھانا بیدی کا محبوب مشغلہ ہے، اس لحاظ سے ان کی کہانیاں ''لاجونتی''، ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' اور ''ببل'' بہت ہی خاص ہیں اور یہاں ان تینوں کہانیوں میں آخرالذکر کہانی یعنی ''ببل'' پر اس وقت تھوڑا سا اظہار خیال مقصود ہے۔

افسانہ ''ببل'' بیدی کے مجموعہ ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' کی ایک خوبصورت اور بامقصد کہانی ہے جس میں افسانہ نگار نے جیسا کہ ابھی اشارہ ہوا، انسانی جبلت کے فطری تناظر میں سماج کی بے راہ روی اور جبلی معصومیت کے مقابلے میں نئے دور کے لوگوں کی خودغرضی کا نقشہ دکھایا ہے۔ ببل افسانے کا بچہ کردار ہے اور اسی کے نام پر کہانی کا نام رکھا گیا ہے۔ درباری لال اس کہانی کا ہیرو ہے جو مہتا گردھاری لال کا بیٹا ہے اور فارورڈ ٹریڈنگ، میں ایک ہی دن میں تین چار لاکھ روپے بنا کر، آرام کی زندگی گزار رہا ہے۔ درباری لال ایک بڑے باپ کا بیٹا ہی نہیں ہے بلکہ خود بھی ایک فرم میں اچھی خاصی اوپری آمدنی پیدا کر لینے والا نوجوان ہے، جو ایک بیوہ عورت لچھن دئی کی اٹھارہ سالہ بیٹی پر ڈورے

ڈالتا ہے اور اس سے جسمانی رشتہ قائم کر لینا چاہتا ہے۔ ایک دن وہ اپنے پڑوس میں رہنے والی بھکارن مصری کو دس روپے دیتا ہے اور اس کا خوبصورت گول مٹول سا بیٹا ایک دن کے لئے مانگ لیتا ہے۔ ساتھ میں سوٹ کیس اٹھاتا ہے، کرایہ کی ٹیکسی لیتا ہے اور ایک خاص مقصد سے سیتا کو لے کر ہوٹل میں چلا جاتا ہے۔ سیتا بھی اس دولت مند نوجوان کو حاصل کرنا چاہتی تھی، اس لئے وہ ہوٹل میں درباری لال کی ہر خواہش پوری کرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے، مگر بالکل ایسے وقت پر دودھ پیتا بچہ ببل رونے چلانے لگتا ہے کہ ان دونوں کا اصل مقصد ہی پورا نہیں ہوتا، اور تب وہ دونوں فیصلہ کر لیتے ہیں کہ ''ہم پہلے شادی کریں گے''۔

بیدی کی اس کہانی میں ممبئی کی زندگی اور وہاں کی بود و باش کا انداز نمایاں ہے۔ اس میں افسانہ نگار نے فنی عناصر کا پورا پورا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے زندگی کی اونچ نیچ کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے اور فٹ پاتھ پر رہنے والوں کی صبح و شام سے لے کر اونچی عمارتوں میں بسنے والے بیپا لوگوں کی زندگی کا عکس پڑھنے والوں کے سامنے رکھ دیا ہے۔ کہانی کی بافت ایسی ہے کہ پڑھنے والوں کی توجہ مرکزی خیال سے اِدھر اُدھر بھٹکنے ہی نہیں پاتی بلکہ وہ ہر لمحہ یہ محسوس کرتا رہتا ہے کہ انسان کی جبلی معصومیت کیا چاہتی ہے اور آج کا سماج اس جبلی معصومیت کا کس طرح دشمن بنتا جا رہا ہے اور بزعم خویش اُسے مٹا کر ہی دَم لینا چاہتا ہے۔

''ببل'' میں جو بھی کردار آئے ہیں وہ با مقصد کردار ہیں اور کسی نہ کسی اہم بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ افسانے کا نسوانی کردار ایک طرف ''بھابھی'' کے روپ میں بانجھ عورت کا نفسیاتی کرب دکھاتا ہے تو دوسری طرف مصری کے روپ میں ایک بھکارن کی نفسیات اور اس کی مجبوری ظاہر کر دیتا ہے۔ سیتا کا کردار ایک خود غرض عورت کا کردار ہے جو ہمیشہ ایک معیار پر نظر آتا ہے کہ وہ درباری لال جیسے دولت مند نوجوان کو ہر حال میں اپنانا چاہتی ہے، چاہے عصمت کے موتی لٹا کر ہو، یا بیاہ کا منگل سوتر پہن کر ہو۔ اس کہانی میں درباری کی بہن ستونتی کا کردار اس بات کی علامت ہے کہ فطری محبت مذہب اور قومیت کی حد بندیوں سے بلند ہوتی ہے، عورت چاہے بھابھی ہو، چاہے ستونتی، چاہے سیتا ہو، چاہے مصری، بہر حال عورت ہے جو فطرتاً کمزور اور مجبور ہوتی ہے، ممتا کے جذبے سے مغلوب ہوتی ہے اور چاہتی ہے کہ کسی بھی قیمت پر کوئی اسے ہمیشہ کے لئے اپنا لے۔ ببل کے حوالے سے عورت کی یہ جبلی معصومیت دراصل بنی نوع انسان کی فطری معصومیت ہے کہ جب فرد یا معاشرہ اس معصومیت سے ٹکراتا ہے تو اس کا انجام ببل، یعنی بلبلہ سے مختلف نہیں ہوتا۔ جس طرح پانی کا بلبلہ ٹوٹ جاتا ہے اسی طرح ایک ببل، غیر جبلی منصوبے کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ معاشرتی تناظر میں دیکھا جائے تو بیدی کی اس کہانی میں کئی ویلن بھی ہیں، ایک تو وہ ہے جو آٹھ آنے کے عوض مصری کو ببل دے گیا تھا، دوسرا گردھاری لال جو پلک جھپکتے لاکھ پتی بن بیٹھا اور تیسرا گردھاری لال کا بیٹا درباری لال جو سیتا کی آبرو لوٹ کر اسے باہر کا راستہ دکھا دینا چاہتا تھا۔

بیدی کے اس افسانے میں زبان و بیان کا پورا شعور ملتا ہے، اس کا ایک کھلا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے بیپا لوگوں سے گاڑھی اردو میں بات نہیں کرائی ہے۔ افسانے کا اسلوب شگفتہ، برجستہ اور استدلالی ہے۔ یہاں بیدی نے دولت مندوں پر اور ان لوگوں پر گہرا طنز کیا ہے جو دولت کی آڑ میں صداقت سے کھلواڑ کر کے خوش ہوتے ہیں اور کسی بھی طرح سچائی پر پردہ ڈال دینا چاہتے ہیں، اتنا ہی نہیں بلکہ بیدی کی اس کہانی میں شیر خوار بچے کی نفسیاتی عکاسی، اس کے انداز دادا کی مرقع کشی، اسے بہلانے، پچکارنے اور کھلانے کا منظر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ہوٹل کے بیرے اور منیجر کی ظاہری اور کھوکھلی شرافت پر بھی بیدی کے قلم سے یہاں طنز کا گہرا وار پڑا ہے اور جھوٹی مذہب پرستی اور نام نہاد قومیت بھی اس وار سے بچ نہیں سکی ہے۔ یہاں جزویات نگاری (سڑک کا کھلا ہوا مین ہول) بامعنی جملے، تجنیس اصوات (سالے، صالح، مجیدار، مزے دار) اور زبان کے استعمال میں کرداروں کے طبقے اور ماحول کا لحاظ، طنز و کسک، حقیقت نگاری اور طرز بیان میں وسیع النظری اور ژرف نگاہی موجود ہے۔

مختصر یہ کہ بیدی نے ''ببل'' کو تمام آداب فن اور لوازمات قصہ سے ساتھ ہمارے سامنے لیا ہے اور اس انداز سے لایا ہے کہ سیتا سے اس کی وقتی نسبت بھی اسے نہ صرف یہ کہ سیتا کے تحفظ کا ذریعہ بنا دیتی ہے بلکہ درباری جیسے کردار کے لئے بھی برائی سے بچ جانے اور اچھی بات سوچ لینے کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ ❁❁

یادیں

صدر عالم گوہر
1155 New Islamabad Nalapar, Bhiwandi, Thane - 421302 (Mob. 7715980144)

کچھ یادیں کچھ باتیں سلام بن رزاق کی

سلام بن رزاق ——— افسانوں کی دنیا کا ایک بڑا نام۔ اگر ممبئی میں ادب پر بات ہوتی ہے تو سلام بن رزاق کا نام سرفہرست ہوتا ہے۔ سلام بھائی ساری زندگی اردو ادب کی خدمت کرتے رہے۔ ان کے افسانے کی دھوم نہ صرف ہندوستان میں، بلکہ جہاں جہاں اردو بولی، سمجھی اور لکھی جاتی ہے، ہر جگہ ہے۔ ان کے افسانے زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع دیتے ہیں۔ ہمارے آس پاس کے افراد ان کے افسانوں کے کردار ہوتے ہیں۔

سلام بھائی خوش مزاج اور سب سے مل جل کر رہنے والے آدمی تھے۔ وہ اپنے چھوٹوں سے بڑی شفقت سے ملتے تھے اور ہم عمر والے سے تو خیر ملتے ہی تھے۔ سلام بھائی ایسے آدمی تھے جن سے کسی کو کوئی شکایت نہیں تھی۔ خفا ہوتے تو میں نے کبھی ان کو دیکھا ہی نہیں۔ میرے ان سے برسوں کے تعلقات تھے۔ میں ان کے ساتھ ممبئی میں کئی پروگرام میں شریک تھا۔

مجھے یاد آرہا ہے، چرنی روڈ میں ہندوستانی زبان کے دفتر میں ایک صاحب کی کتاب کا اجرا تھا۔ انھوں نے مرزا غالبؔ کے شعر ؎

بوئے گل ، نالۂ دل ، دود چراغ محفل
جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

کے پہلے مصرعے کے ہر ٹکڑے پر ایک کتاب کا نام رکھا تھا۔ یعنی ایک کتاب کا نام ''بوئے گل''، دوسری کتاب کا نام ''نالۂ دل'' اور تیسری کتاب کا نام ''دود چراغ محفل'' یا چراغ محفل تھا۔ بڑے تزک واحتشام سے اس کتاب کے اجرا کی تقریب کا انعقاد ہوا تھا۔

اس تقریب میں اظہار خیال کرنے والوں میں کئی حضرات کے ساتھ ساتھ سلام بھائی بھی تھے۔ پروگرام شروع ہوا، بڑا اچھا پروگرام چل رہا تھا کہ ایک حضرت کی باری آئی۔ انھوں نے اس کتاب کی بہت سی خامیوں کو اس طرح سے بیان کیا کہ اس کتاب کا تاثر ہی بگڑ گیا۔ صاحب کتاب کا چہرہ اتر گیا کہ بھائی اتنی محنت اور جانفشانی سے کتاب لکھی، پیسے خرچ کرکے اس کی اشاعت کرائی اور ان کے بیان سے تو لگتا ہے میں نے کچھ کیا ہی نہیں، میری ساری محنت اکارت گئی۔ سامعین اور متعلقین کا چہرہ بھی اتر گیا۔

اس کے بعد سلام بن رزاق کی باری آئی۔ شاید صدارت سلام بھائی کی ہی تھی۔ انھوں نے سارے معاملے کو سلجھا دیا۔ کتاب کا تعارف اور تبصرہ اس طرح کیا کہ ساری کدورت دور ہوگئی اور کتاب کا مرتبہ پھر بحال ہوگیا۔ سلام بھائی نے اس طرح سے کتاب کی خوبیوں کو بیان کیا کہ اس کتاب کی اگر کچھ خامیاں بھی تھیں تو وہ ہوا ہوگئیں اور معمولی سہو جیسی دکھائی دینے لگی، پھر ماحول خوشگوار ہوگیا۔ صاحب کتاب کا چہرہ جو مرجھا گیا تھا، وہ پھر کھل گیا۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے۔ اتفاق سے اس پروگرام میں بھی میں تھا۔ ہوا یہ کہ ندؔا فاضلی کی شاعری کا مراٹھی زبان میں ترجمہ لوک ناتھ یشونت نے کیا تھا۔ اس کتاب کو شائع کیا تھا ممبئی کے ہی ایک ادارے نے۔ ندؔا فاضلی جس طرح اردو میں مقبول تھے، اسی طرح ہندی، گجراتی اور مراٹھی میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کئی سالوں کی جدوجہد کے بعد لوک ناتھ یشونت نے ندؔا فاضلی کی منتخب شاعری کا ترجمہ مراٹھی زبان میں کیا تھا۔ یہ کتاب کئی سالوں سے ترجمے کی عمل میں تھی۔ لوک ناتھ یشونت کئی بار ندؔا فاضلی سے اس سلسلے میں مل چکے تھے اور اپنے ترجمے کی مراحل کو ان سے بیان کرچکے تھے۔ افسوس کہ جب یہ کتاب مراٹھی میں شائع ہوئی تو ندؔا فاضلی کا انتقال ہو چکا تھا۔ ممبئی کے ایک بڑے ہال میں اس کتاب کا اجرا تھا۔ اظہار خیال کرنے والوں میں ہندی، اردو اور مراٹھی کے ادیب ودانشور

تھے۔ اردو اور مراٹھی دونوں زبانوں سے بہ خوبی واقفیت رکھنے والے ادیب میں سلام بن رزاق اور ایک اور صاحب تھے۔

کتاب کے اجرا کا پروگرام بڑے تزک واحتشام سے چل رہا تھا۔ایک صاحب جو اردو اور مراٹھی دونوں سے واقف تھے۔انھوں نے ابتدا ہی کتابوں کی خامیوں سے کی۔لمبی تقریر میں انھوں نے کتاب کی خوبیوں کو نظرانداز کر کے کتاب کی خامیوں پر ہی روشنی ڈالنی شروع کی۔ انھوں نے یہ بھی خیال نہیں کیا کہ ایک غیر اردو داں جس کی مادری زبان مراٹھی ہے اور جو خود مراٹھی زبان کا ایک معتبر شاعر ہے۔اس کے دل پر کیا گزرے گی۔ وہ تو سوچے گا کہ میں نے اردو کا مراٹھی میں ترجمہ کر کے جیسے کوئی بڑا پاپ کر دیا ہو۔

سامعین میں ندا فاضلی کی شریک حیات مالتی جوشی اور ندا فاضلی کی دختر تحریر بھی تھیں ندا فاضلی کے ساتھ میں بھی بیٹھا تھا۔ میں نے مالتی جوشی کا چہرہ بھی دیکھا کہ خوش نہیں تھا اور بھی کئی مقرر مراٹھی میں تقریر کر کے اور کتابوں کی تعریف کر کے جا چکے تھے، مگر اس تقریر نے ان سب کی تعریف کا اثر زائل کر دیا۔

اس کتاب کی اجرا کے پروگرام کے صدر سلام بن رزاق تھے۔انھوں نے ندا فاضلی، مترجم لوک ناتھ یشونت اور کتاب پر بات کرتے ہوئے کتاب کو اس طرح پیش کیا کہ کتاب میں خوبیاں ہی خوبیاں نظر آنے لگیں اور مترجم کی خوب حوصلہ افزائی کی۔

سلام بن رزاق چونکہ خود ایک مترجم ہیں اور مترجم کی پریشانیوں سے بخوبی واقف ہیں۔ انھوں نے مراٹھی کے سب سے مشکل افسانہ نگار جی-اے-کلکرنی کے مراٹھی افسانوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ اردو سے مراٹھی میں ترجمہ ایک بہت مشکل کام ہے، کیونکہ اردو کے کچھ الفاظ اور محاورے ایسے ہیں جن کا نعم البدل مراٹھی میں نہیں ہے۔ بہرحال اپنے تاثرات سے سلام بن رزاق نے ایک اچھے پروگرام کو خراب ہوتے ہوتے بچا لیا اور ان کی تقریر کے بعد لوک ناتھ یشونت کے چہرے پر اعتماد لوٹ آیا۔

جب میں ''اردو زبان کے اثرات مراٹھی زبان پر'' کے موضوع پر تحقیق کر رہا تھا تو میں سلام بن رزاق کے گھر گیا تھا، کیونکہ سلام بھائی اردو اور مراٹھی دونوں پر دسترس رکھتے تھے۔ان سے اس تعلق سے گفتگو ہوئی تو انھوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور ''جی-اے-کلکرنی کی کہانیاں'' نام کی کتاب بھی دی، مگر میں جی-اے-کلکرنی کی اصل کہانی جو مراٹھی زبان میں تھی میں اُسے پڑھنا چاہتا تھا تاکہ میں اپنی تحقیق میں لکھ سکوں کہ جی-اے-کلکرنی نے اپنی مراٹھی کہانیوں میں کہاں کہاں اردو الفاظ کا استعمال کیا ہے۔

میں نے سلام بھائی سے جی-اے-کلکرنی کی وہ کہانیاں مانگیں تو انھوں نے کہا میں نے کسی ایک کتاب سے کہانیوں کا ترجمہ نہیں کیا ہے۔ میں نے جی-اے-کلکرنی کی کئی کتابوں سے منتخب کر کے ان کہانیوں کا ترجمہ کیا ہے اور ان مراٹھی کہانیوں کی کتابیں میرے پاس ایک ایک ہی ہیں، میں وہ آپ کو نہیں دے سکتا۔

میں نے کہا سلام بھائی آپ وہ کتابیں دیجئے میں اپنے موبائل سے ان کہانیوں کی تصویریں کھینچ لوں گا اور کتاب آپ کو واپس دے دوں گا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو بہانے بناتا کہ یار وہ سب ڈھونڈنا پڑے گا۔ بہت پرانی بات ہوگئی، پتہ نہیں کہاں رکھ دی، مگر سلام بھائی کی محبت، حوصلہ افزائی اور تعاون کا جذبہ کہ انھوں نے ان مراٹھی کہانیوں کی کتابوں کو تلاش کر کے مجھے دیا اور میں نے ان کہانیوں کی تصویریں کھینچیں جو میرے بڑے کام آئیں۔ بڑے شاعر وادیب اتنی شفقت کہاں دکھلاتے ہیں، مگر سلام بھائی کی شخصیت میں اتنا بڑا ادیب ہوتے ہوئے بھی ذرہ برابر غرور نہیں تھا۔ جب بھی ملتے خندہ پیشانی سے ملتے۔

میں نے ایک اور اردو مراٹھی کے بڑے نام والے صاحب سے بھی ایک کتاب کی خواہش ظاہر کی تھی، انھوں نے یہی جواب دیا تھا کہ پتہ نہیں کتاب کہاں ہے، حالانکہ میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ کتاب کہیں دستیاب نہیں ہے، پھر بھی انھوں نے بہانہ بنا لیا۔ سلام بھائی نے نہ صرف مجھے اپنی کتابیں دیں بلکہ میری رہنمائی بھی کی۔

کبھی کبھی انسان بہت چاہ کر بھی کچھ نہیں کر پاتا ہے۔ میں نے بہت چاہا کہ سلام بھائی پر لکھوں، سلام بھائی کے لئے کچھ کروں، مگر نہیں کر سکا۔ سلام بھائی جب بھی ملتے، مسکراتے ہوئے کہتے:

''گوہر! تم صرف فلم والوں کے پیچھے پڑے رہتے ہو۔

صرف انہیں لوگوں پر لکھتے ہو۔ ہم لوگوں کے لئے کچھ کرتے ہی نہیں۔''

میں نے دل سے چاہا کہ سلام بھائی کے لئے کچھ کروں اور اسی سلسلے میں مجھے آل انڈیا ریڈیو ممبئی سے جب کہا گیا کہ ساٹھ سال سے زائد عمر کی کسی شخصیت کو جس کی کسی بھی فیلڈ میں نمایاں کارکردگی ہو، یہاں اسٹوڈیو میں بلا کر انٹرویو کیجئے۔ یہ تین گھنٹے کا انٹرویو ہوگا۔ ڈیڑھ گھنٹے کا لنچ بریک ہوگا اس کے بعد پھر انٹرویو کا سلسلہ جاری رہے گا تو اس کڑی میں، میں نے معروف فلمی نغمہ نگار اور شاعر نقش لائل پوری کا تین گھنٹے کا انٹرویو لیا تھا اور اسی پروگرام کے لئے میں سلام بن رزاق سے ملا۔ ان کا بایوڈاٹا لیا اور ریڈیو اسٹیشن میں جمع کیا، پھر چند دنوں کے بعد جب میں نے آل انڈیا ریڈیو ممبئی سے اس سلسلے میں پوچھا کہ کب انٹرویو کا وقت مقرر ہوا تو اس وقت آل انڈیا ریڈیو میں زبیر خان اردو پروگرام کے پیکس تھے۔ انھوں نے کہا کہ بجٹ کی وجہ سے اس پروگرام کو بند کر دیا گیا ہے۔

ان دنوں میرے اکثر فلم والوں کے انٹرویو اردو دنیا میں شائع ہوتے تھے۔ میں نے انٹرویو کرنے سے پہلے اردو دنیا میں پوچھا تھا کہ سلام بن رزاق کا انٹرویو لے کر بھیجوں تو ادھر سے کہا گیا کہ سلام بن رزاق کا انٹرویو اردو دنیا میں شائع ہو چکا ہے اور اردو دنیا کی شرط کے مطابق جن کا انٹرویو ایک بار شائع ہو جاتا ہے۔ دوبارہ اس کا انٹرویو شائع نہیں ہوتا۔ اس طرح میں سلام بھائی کے کام یہاں بھی نہیں آسکا۔ اب ایک انٹرویو لے کر آج کل میں بھیجا ہے، وہ اب تک شائع نہیں ہوا ہے۔ اگر شائع ہو جائے گا بھی تو سلام بھائی دیکھ نہیں سکیں گے۔ یہ قلق میرے دل میں رہ ہی جائے گا کہ سلام بھائی نے میرے لئے بہت کچھ کیا، لیکن میں سلام بھائی کے لئے کچھ نہیں کر سکا۔

جب میں نے ندا فاضلی کے شعری مجموعے ''کھویا ہوا سا کچھ'' کا میتھلی زبان میں ترجمہ کیا تو دل میں آیا کہ سلام بن رزاق کے ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ افسانوی مجموعہ ''شکستہ بتوں کے درمیان'' کا بھی اردو زبان سے میتھلی زبان میں ترجمہ کروں اور اسی مناسبت سے میں نے جب سلام بھائی سے فون پر کہا کہ (تب میں بھائیکلہ چھوڑ کر بھیونڈی میں رہائش اختیار کر لی تھی) مجھے آپ کا افسانوی مجموعہ ''شکستہ بتوں کے درمیان'' چاہئے، میں اس کا اردو سے میتھلی میں ترجمہ کرنا چاہتا ہوں، تو پہلے تو انھوں نے پرخلوص مشورہ دیا کہ پہلے ترجمے کے لئے ساہتیہ اکادمی کو درخواست دے دو۔ وہاں سے منظور ہو جائے تو پھر ترجمہ کرنا، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ کتاب کی اشاعت میں کتنا خرچ ہوتا ہے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ میتھلی زبان میں اس کے ترجمے کے لئے کوئی رخنہ حائل نہیں ہوگا کیونکہ اس کتاب کا پنجابی اور کئی زبانوں میں ساہتیہ اکادمی سے ترجمہ ہو چکا ہے، پھر سلام بھائی نے کہا تم میرا روڈ کیوں آؤ گے وہیں تمہاری بھیونڈی میں ایم۔مبین ہیں ان کو میں نے ''شکستہ بتوں کے درمیان'' دی تھی، ان سے لے کر ترجمہ کرلو۔ میں نے اس کتاب کا ترجمہ کر لیا اور درخواست ساہتیہ اکادمی دہلی کو بھیج دی، لیکن شاید خدا کو منظور نہیں تھا۔ ساہتیہ اکادمی نے سلام بھائی کی ''شکستہ بتوں کے درمیان'' کے بجائے رام لال کے افسانوی مجموعے ''پکھیرو'' کو اردو زبان سے میتھلی زبان کے ترجمے کے لئے بھیج دیا۔ مجھے بہت دکھ ہوا کہ سلام بھائی کی کتاب کا ترجمہ شائع نہیں ہو سکا۔

سلام بھائی کے ساتھ بہت سی یادیں ہیں۔ چند یادیں یہاں شیئر کر رہا ہوں۔ سلام بھائی کو ندا فاضلی کی کتابوں کی بڑی فکر تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے کہا تھا کہ ندا صاحب کی لائبریری بہت رچ ہے۔ ان کی کتابیں ضائع نہیں ہونی چاہئیں۔ ندا صاحب کے نام پر ایک لائبریری کھولنے کا منصوبہ میرے ذہن میں ہے۔ میرا روڈ میں ان کا فلیٹ بھی ہے، کیوں نہ اس کو ندا لائبریری بنا دیا جائے تا کہ اس لائبریری سے شاعر ادیب اور کتابوں کے شائقین فائدہ حاصل کر سکیں۔ میں نے اس سلسلے میں مالتی جوشی سے بات بھی کی، لیکن بات نہیں بن سکی۔ ندا صاحب کے میرا روڈ کے فلیٹ کے بارے میں انھوں نے کچھ اور ہی سوچ رکھا تھا۔ فی الحال ندا صاحب کی ساری کتابیں ان کے ورسوا والے فلیٹ پر اسی کمرے میں، جس میں وہ رہتے تھے محفوظ ہے۔ آگے کیا ہو خدا جانے۔

سلام بھائی چونکہ خود ایک معتبر نام تھے اور خود بھی اعلیٰ درجے کے مترجم تھے، انھیں ساہتیہ اکادمی کا ترجمہ کا ایوارڈ بھی مل چکا تھا۔ اس لئے میں جب میتھلی زبان کے افسانوں میں سے انتخاب کر کے ایک افسانوں کا مجموعہ اردو زبان میں ''عنکبوت'' کے نام سے ترجمہ کیا تو اس پر دیباچہ لکھنے کے لئے سلام بھائی کو دیا۔ میں جانتا تھا کہ سلام بھائی دیباچہ وغیرہ

نہیں لکھتے ہیں، لیکن ان کی مجھ پر شفقت تھی کہ انھوں نے عنکبوت پر اظہارِ خیال قلم بند کیا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ اس کتاب کو ایک مستند ادیب نے پڑھا ہے اور اس پر اپنی رائے لکھی ہے۔

جب سلام بھائی مہاراشٹر ٹیکسٹ کمیٹی کے ممبر تھے، تب میں نے ان کو اپنی بچوں پر لکھی ایک کہانی دی تھی تاکہ ممکن ہو تو مہاراشٹر کے نصاب میں اس کہانی کو شامل کر دیں۔ سلام بھائی نے اس کہانی کو بورڈ کے سامنے رکھا، لیکن کسی وجہ سے وہ کہانی منظور نہیں ہو سکی۔

جب ندؔا فاضلی کی کتاب ''شہر میں گاؤں'' آئی تھی۔ ان دنوں میں ندؔا فاضلی سے ملنے گیا تھا۔ جب میں واپس آنے لگا تو ندؔا فاضلی نے کہا اب کدھر جانا ہے تو میں نے کہا میرا روڈ جاؤں گا، تو ندؔا صاحب نے مجھے ''شہر میں گاؤں'' دیا اور کہا کہ یہ میرا روڈ میں سلام بن رزاق کو دے دینا۔ اتفاق سے جب میں نے میرا روڈ پہنچ کر سلام بھائی کو فون کیا تو انھوں نے کہا ''گوہر! میں ابھی باہر ہوں۔ سکندر مرزا کے آفس میں کتاب دے دو میں آؤں گا تو لے لوں گا۔'' سلام بھائی کی ندؔا فاضلی اور سارے ممبئی کے شاعروں و ادیبوں سے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی سے ملنا جلنا تھا۔ انھوں نے راجندر سنگھ بیدی کے بارے میں بتلایا تھا کہ بیدی مجھے بہت چاہتے تھے۔ اس کا ایک واقعہ بھی سنایا تھا کہ کس طرح بیدی انتقال سے کچھ دنوں پہلے اپنے گھر کی کتابیں ایک لائبریری کو دینے کے لئے نکال رہے تھے کہ نکالنے والے نے سلام بھائی کا افسانوی مجموعہ ''ننگی دوپہر کا سپاہی'' بھی لائبریری کو دینے کے لئے نکالا تھا کہ بیدی صاحب کی نظر پڑی اور انھوں نے سلام بھائی کی کتاب اس میں سے نکال کر اپنے شیلف میں رکھ لی۔

سلام بھائی کے میرا روڈ کے گھر جب بھی جاتا تو بغیر کھانا کھائے نہیں آنے دیتے اور آتے وقت تحفتاً کئی کتابیں دیتے، جن میں ''زندگی افسانہ نہیں'' ان کے لکھے گئے خاکے ''تذکرے''، ''شکستہ بتوں کے درمیان'' انہوں نے بچوں کے لئے جو کہانیاں لکھی وہ کتابیں اور جو تراجم کئے وہ ساری کتابیں ہیں جو وقتاً فوقتاً انھوں نے مجھے دیں۔ باتیں بہت سی ہیں، کہاں تک بیان کروں۔ اللہ مرحوم کو جنت الفردوس عطا کرے۔ آمین ۔

یوں تو دنیا میں سبھی آتے ہیں جانے کے لئے
موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس

❁❁❁

افسانہ ''ندی'' کا تجزیہ

سلام بن رزاق کی کہانی ''ندی'' علامتی حقیقت نگاری کی ایک روشن مثال ہے۔ یہاں افسانہ نگار نے ندی کو زندگی اور انسانیت کی علامت بنا کر لایا ہے۔ یہ ندی اگر کئی جزیروں میں بٹ گئی ہے تو یہ موجودہ دور میں انسانی معاشرے کے افتراق کی علامت ہے اور اس پر اگر مینڈکوں کا قبضہ ہو چکا ہے اور مچھلیاں پانی کے بغیر یا پانی سے باہر تڑپ رہی ہیں تو اس کا مطلب یہی ہے کہ آج کے سماج دشمن عناصر، شریفوں اور نیک طینت انسانوں کی بستی پر قابض ہو چکے ہیں اور مظلوم و مفلوک انسانوں سے جینے اور بسنے کا حق چھین لیا گیا ہے، یہاں تک کہ آزادی سے تیرنے کی فطرت رکھنے والے بے بسی سے تڑپنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ سلام بن رزاق کی اس کہانی میں جھینگر اور کیڑے مکوڑے بھی ذیلی کردار بن کر آئے ہیں جو بنیادی کرداروں کی استعاراتی معنویت مزید اجاگر کر دیتے ہیں۔ یہ کہانی جذباتی کشاکش سے گزر کر ایک ہیجان آفریں کلائمکس سے قریب ہو جاتی ہے اور پھر ایک خلاف امید، مگر عین فطری اور منطقی انداز سے اپنے انجام کو پہنچتی ہے اور اپنے قاری کو وحدت تاثر سے ہم کنار کر جاتی ہے۔ سلام بن رزاق کی اس کہانی میں چھوٹے بڑے جزیرے اصلاً اُس تقسیم کی علامت ہیں جو طبقاتی، نسلی اور معاشرتی و مذہبی گروہوں کی تقسیم ہے اور مینڈکوں کی رزمیہ مسابقت اس طبقاتی معاشرے کے قائدین کی مسابقت ہے جنہیں ہر حال میں اپنا مفاد عزیز ہوتا ہے اور اس کے لئے وہ عجیب عجیب حربے اپناتے ہیں اور نت نئے روپ دھارتے ہیں۔ سلام بن رزاق کی ''ندی'' میں اچانک نمودار ہونے والے مگرمچھ کی للکار اور پھر اس للکار پر توجہ نہ دینے والوں کے حق میں اس کی سفاک دعا بھی کہانی کے باقاعدہ علامتی نظام ہی سے جڑی ہوئی ہے اور پھر سیلاب بلا کے خوف سے دہشت زدہ ہو کر مینڈکوں کا گدلے پانی میں چھلانگ لگا دینا اس بات کا اشارہ ہے کہ زندگی اور زمانے کے دشمنوں کو اپنے دائرے میں سمٹ جانے کا وقت دور نہیں ہے۔ افسانہ نگار کا اصل کمال یہی ہے کہ اس نے علامتوں کو چیستاں نہیں بنایا ہے اور یاسیت کی فضا پر رجائیت کے کامیاب وار کا نقشہ دکھا دیا ہے۔ (ماخوذ)

ڈاکٹر محمد ممتاز فرخ

"Book Emporium" Sabzibagh, Patna - 800004 (Mob. 9798909392)

محمد یونس ہرگانوی: حیات وخدمات

ادیب، شاعر اور صحافی محمد یونس ہرگانوی کو تقریباً لوگ بھول گئے ہوں گے۔ انہوں نے خود کو کبھی پروجیکٹ نہیں کیا۔ انہیں چھپنے چھپانے میں زیادہ رغبت نہیں تھی۔ وہ زندگی بھر گوشہ نشینی اختیار کیے رہے، البتہ یہ ضرور ہے کہ انہوں نے اپنی علمی صلاحیت سے دوسروں کو فیض پہنچانے میں کچھ بھی کمی نہیں کی۔ وہ درس وتدریس سے وابستہ اور عربی اور فارسی زبان میں بڑی صلاحیت کے مالک تھے۔

جب ان کی صلاحیت کی بات نکلی ہے تو ایک واقعہ کا ذکر ذرا ضروری لگتا ہے۔ ایک صحافی کی دینی کتاب چھپ کر ان کے پاس آئی۔ وہ اس کا مطالعہ کرنے لگے۔ میں ان کے پاس میں اکثر جایا کرتا تھا، میں نے دیکھا وہ اس کتاب کا بڑی باریکی سے مطالعہ کر رہے تھے اور لال روشنائی سے اس میں جا بجا تصحیح کرتے جا رہے تھے۔ اس تعلق سے انہوں نے بس اتنا ہی کہا کہ اگر اس میں غلطیاں رہ گئیں تو لوگ پڑھ کر گمراہ ہوں گے اور اللہ کے یہاں اس کی پکڑ بھی ہوگی، اس لیے اس کام میں بڑی سوجھ بوجھ کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ کام ہر کسی کو اپنے ہاتھ میں نہیں لینا چاہئے۔ پوری کتاب پر نظر ثانی کرنے کے بعد کتاب انہوں نے واپس کر دی اور اس کا کسی سے ذکر نہیں کیا اور مجھے بھی منع کر دیا۔

محمد یونس ہرگانوی فارسی کے استاد تھے۔ مقابلہ جاتی امتحان کی تیاری کرنے کے لیے کچھ بچے ان کے پاس آتے تھے۔ انہیں اعزازی طور پر فارسی پڑھاتے تھے۔ یونیورسٹی وکالج کے فارسی کے اساتذہ بھی ان کے پاس آتے تھے جن سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ ''فارسی شیریں'' اور ''فارسی شکریں'' محمد صدرالدین فضا کی مرتب کردہ فارسی کتاب ایک زمانے میں مختلف یونیورسٹی کے بی اے کے نصاب میں شامل تھی۔ ایک پبلشر کی فرمائش پر انہوں نے اس کی شرح لکھی تھی۔ کافی دنوں تک یہ کتاب داخل نصاب رہی۔

''ملک بک ڈپو'' کے نام سے ایک کتاب کی دکان ہوا کرتی تھی۔ ''ملک بک ڈپو'' کے مالک اتفاق سے ان کے دوستوں میں سے تھے۔ یہ دکان ''چوہٹہ'' میں اشوک راج پتھ (پٹنہ) پر تھی۔ ان کی فرمائش پر محمد یونس ہرگانوی صاحب نے درجنوں درسی کتابوں کی شرح لکھی۔ یہ دکان اب ختم ہوگئی ہے۔ ان کے وارثین اب کوئی اور کاروبار کرتے ہیں۔

تعلیم سے فراغت کے بعد محمد یونس ہرگانوی روزنامہ ''سنگم'' سے وابستہ ہوگئے۔ ان کی صلاحیت ومحنت کے پیش نظر اخبار کے مالک و مدیر اور معروف سیاست داں غلام سرور صاحب انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب ''سنگم'' اخبار کا دفتر لالہ زار منزل، دریاپور میں ہوا کرتا تھا۔ غلام سرور صاحب کو بے باک صحافت کے سبب جیل بھی جانا پڑا۔ ان کی غیر موجودگی میں اخبار کا اداریہ عام طور پر محمد یونس ہرگانوی لکھا کرتے تھے۔ محمد یونس ہرگانوی اپنی پسند کی کتابیں بازار سے خرید کر جیل میں غلام سرور صاحب کو پہنچاتے تھے، جنہیں وہ پسند کرتے تھے اور حسب ذوق ان کا مطالعہ کرتے تھے۔

شاعر وادیب سماج کا ایک حساس شخص ہوتا ہے۔ وہ آس پاس یا سماج میں رونما ہونے والے واقعات وحالات کو شعری تخلیقات کے پیکر عطا کرتا ہے۔ محمد یونس ہرگانوی نے بھی اپنے زمانے میں حکومت کے غلط رویے کے خلاف ایک طویل نظم لکھی جو ایک کتابچہ کی شکل میں شائع ہوئی۔ اس کتابچہ کا نام تھا ''لاٹھی گولی کی سرکار'' گو کہ اس میں نظم نگار یا طابع اور ناشر کی حیثیت سے کسی کا نام نہیں تھا۔ کافی تعداد میں اس کتابچہ کی کاپیاں جب اُس گودام میں ملیں جس میں پہلے وہ رہا کرتے تھے تو میرے دریافت کرنے پر انہوں نے اس کی تصدیق کی۔ انہوں نے بتایا کہ ہاں یہ میری طویل نظم ہے۔ غالبًا یہ کتابچہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے درمیان تقسیم نہیں ہو سکا تھا۔ محمد یونس ہرگانوی صاحب جس

کمرے میں رہتے تھے، وہ کمرہ بعد میں جب ان کے خالہ زاد بھائی حمید انور (میرے والد محترم) کاروبار کے سلسلے میں پٹنہ آئے تو ان کے حوالہ کردیا اور وہ دوسری جگہ چلے گئے۔ یہ کمرہ ''بندھو مختار بلڈنگ'' میں تھا جو پروفیسر رضیہ تبسم صاحبہ کے رشتہ داروں کا خاندانی مکان تھا۔ ''بک امپوریم'' قائم کرنے میں محمد یونس ہرگانوی کا اہم رول رہا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے میرے والد حمید انور مرحوم کی بڑی مدد کی تھی۔ ان کے حلقہ میں چونکہ دوست احباب، صحافی و ادیب تھے، لہٰذا ان لوگوں کا بھی کافی تعاون رہا۔ ابتدائی دنوں میں پروفیسر علی حیدر نیر، جناب بیتاب صدیقی اور دوسرے احباب سے تعلقات استوار ہونے لگے جو محمد یونس ہرگانوی صاحب کے دوستوں میں تھے۔

محمد یونس ہرگانوی بہت محنتی انسان تھے۔ ان کا معمول تھا کہ وہ بی۔ این۔ کالجیٹ اسکول سے نکلنے کے بعد ''ورما پریس'' جاتے تھے، جو بی۔ این۔ کالج کے سامنے تھا۔ اُس وقت ورما پریس واحد ایسا ادارہ تھا، جہاں ابتدائی کلاس سے آٹھویں نویں کلاس تک کا سوالنامہ تیار ہوتا تھا۔ اس ادارہ سے اگرچہ ہندی میڈیم میں سوالات تیار ہوتے تھے، لیکن اُس وقت بہت سارے اسکولوں میں اُردو میڈیم سے بھی پڑھائی ہوا کرتی تھی، لہٰذا جب کہیں اردو سوال نامہ کی ضرورت پڑتی تھی، اس ضرورت کو ''ورما پریس'' پوری کرتا تھا۔ کافی دنوں تک ''ورما پریس'' والے محمد یونس ہرگانوی کی خدمات حاصل کرتے رہے۔ یونس صاحب ہندی سوال نامے کو اُردو میں ترجمہ کرتے اور گویا اس طرح اردو سوالنامہ تیار کردیتے تھے۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا، لیکن انہوں نے اس مشکل کام کو بحسن وخوبی انجام دیا۔ میں نے یہ دیکھا ہے کہ جب ان کی صحت ذرا خراب ہوئی اور باہر نکلنا کم ہونے لگا تو ان کا کام گھر پر آجاتا تھا اور وہ گھر پر ہی کام کردیتے تھے۔

ممتاز صحافی، معلم اور شاعر جناب محمد یونس ہرگانوی کا ۱۲ جون ۲۰۰۶ء کو پٹنہ میں انتقال ہوا۔ ان کی پیدائش نالندہ ضلع کے موضع ہرگانواں میں ہوئی تھی۔ محمد یونس ہرگانوی کی تعلیم مدرسہ اسلامیہ، رانچی اور مدرسہ شمس الہدیٰ، پٹنہ میں ہوئی تھی۔ مدرسہ شمس الہدیٰ، پٹنہ میں ان کے اساتذہ میں مولانا سید عروج احمد قادری، مولانا حفیظ الرحمٰن، مولانا سید ابوالقاسم دربھنگوی، مولانا حافظ عبید الرحمٰن، مولانا سید نجم الہدیٰ، مولانا حافظ ظہیر احمد اور مولانا عبدالصمد صاحب تھے۔ اس وقت مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے پرنسپل مولانا ریاست علی ندوی تھے۔ ان کے ساتھیوں میں پروفیسر عبدالمغنی، پروفیسر ابوذر عثمانی اور پروفیسر شمیم احمد صدیقی قابل ذکر ہیں۔ جناب محمد یونس ہرگانوی تعلیم سے فراغت کے بعد بی۔ این۔ کالجیٹ، پٹنہ میں اردو فارسی کے اُستاد ہوئے اور اسی اسکول سے ۱۹۹۶ میں سبکدوش ہوئے۔

محمد یونس ہرگانوی کا شمار اپنے حلقہ کے کامیاب اساتذہ میں ہوتا تھا۔ معلّمی کے علاوہ صحافت سے ان کا گہرا شغف رہا۔ وہ مختلف اخبار سے منسلک رہے۔ غلام سرور صاحب کے اخبار ''سنگم'' سے ان کی گہری وابستگی تھی۔ غلام سرور صاحب کے جیل چلے جانے کے بعد یونس صاحب کی محنت وصلاحیت کے سبب یہ اخبار اسی آب وتاب سے نکلتا رہا۔ انہوں نے اس اخبار میں کالم نویسی بھی کی اور یہ کالم قارئین کے درمیان مقبول بھی ہوا۔ عرصہ دراز تک وہ اس اخبار سے وابستہ رہے اور نو آموز صحافیوں کی تربیت کا فریضہ بھی انجام دیا۔

محمد یونس ہرگانوی کے مضامین مختلف اخبارات ورسائل میں بکھرے پڑے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے۔ ان کی شاعری جامعیت وصالحیت کا مرقع ہوتی تھی۔ ان کا شعری مجموعہ ''اماوس کے تارے'' ان کی زندگی میں ترتیب پا چکا تھا، جسے بعد میں ان کے لائق فائق اکلوتے صاحبزادے محمد ابوطلحہ رومی نے شائع کیا۔

محمد یونس ہرگانوی ایک قناعت پسند آدمی تھے، شاید اسی کا یہ نتیجہ رہا کہ انہوں نے اپنی زندگی میں ایک چھوٹا سا آشیانہ تک نہیں بنایا البتہ ان کے صاحبزادے محمد ابوطلحہ رومی نے دریاپور، پٹنہ میں ایک چھوٹا سا آشیانہ بنالیا ہے۔ والد کی بہت ساری خوبیاں ان میں ہیں۔ محمد ابوطلحہ بھی شاعری کا ذوق رکھتے ہیں اور وہ بھی درس وتدریس سے وابستہ ہیں۔

''دانش کدہ'' کے نام سے محمد یونس ہرگانوی نے دریاپور، پٹنہ میں ایک کتاب کی دکان کھولی تھی۔ یہاں سے کچھ کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں۔ ادارہ ''دانش کدہ'' کو ان کے صاحبزادے زندہ کئے ہوئے ہیں۔

محمد یونس ہرگانوی نظم کے بہترین شاعر تھے۔ وہ عمدہ نثر بھی

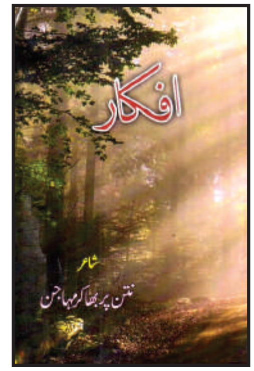

لکھتے تھے۔ان کے مضامین نویں، دسویں کلاس کے بہار بورڈ کے نصاب میں شامل ہیں۔ وہ چھپنے چھپانے سے عموماً بے نیاز رہتے تھے، لہٰذا ان کی زندگی میں ان کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے نے ادارہ ''دانش کدہ'' سے ''اماوس کے تارے'' شائع کیا۔اس مجموعہ کے علاوہ اخبارات ورسائل میں اشاعت یافتہ ان کی غزلیں اور نظمیں وغزلیں اور ان کا کچھ غیر مطبوعہ کلام بھی محفوظ ہے۔''اماوس کے تارے'' میں محمد ابوطلحہ کی ''محمد یونس ہرگانوی:شخصیت اورفن'' اور ڈاکٹر ہمایوں اشرف کی ''حرف چند' ' کے عنوان سے تحریریں شامل کتاب ہیں۔ڈاکٹر ہمایوں اشرف اپنے''حرف چند''میں لکھتے ہیں:

''محمد یونس ہرگانوی بسیار نویس نہیں تھے،لیکن شعرو نثر سے ان کی وابستگی اٹوٹ تھی۔ انہوں نے چھپنے چھپانے کے سلسلے میں کبھی سرعت نہیں دکھائی، گوشہ گیر رہےاوراپنی تمام ترانا کے ساتھ۔کاتااورلےڈوری والا معاملہ نہ تھا۔وہ شہرت حاصل کرنے والوں کے ریس میں نہیں رہے اور اپنی تخلیقی کاوشوں سے مطمئن ،سکون و اطمینان کی زندگی بسر کرتے رہے۔ان کی اس افتادطبع سے ان کا نقصان بھی ہوا۔ان سے کمتر درجے کے لوگ شہرت کے مدراج پر متمکن ہوگئے،لیکن ان کی بوریانشینی انہیں ہرطرح قانع رہنے پرمجبورکرتی رہی۔

دنیا اگر دهند نه جنیم زجای خویش
من بسته ام حنای قناعت به پای خویش

(اماوس کے تارے،حرف چند،۲۰۰۸،ص۱۰)

محمد یونس ہرگانوی تنقیدی شعور بھی رکھتے تھےاورموقع بہ موقع اس کا اظہار بھی کرتے تھے۔معصوم اشرفی اسیؔر کے مجموعہ''داغ مسکراتے ہیں''(اشاعت ۱۹۸۹)میں'' آمد کا شاعر'' کے زیرعنوان محمد یونس ہرگانوی لکھتے ہیں:

''معصوم ایک بے حد حساس شاعر ہے۔احساسات کی شدت اسے دیوانہ بنائے رکھتی ہے۔وہ ہمہ دم حال میں رہتا ہےاوردمادم قال کاظہور ہوتارہتا ہے۔شبانہ روز کے نرم گرم احساسات شبانہ روزشعری پیکر میں ڈھلتے رہتے ہیں۔''(شعلوں کے پھول،۲۰۰۰ء،ص۱۰)

محمد یونس ہرگانوی مزاح سے شعرونثر دونوں جگہ خوب خوب کام لیتے تھے۔''شعلوں کے پھول'' کے مرتب کی حیثیت سے وہ لکھتے ہیں:

''میرؔ، غالبؔ، مومنؔ، سعدیؔ، حافظؔ، خسروؔ یاکسی بھی زبان کے کسی بھی بڑے سے بڑے شاعر کو یہ مہارت کاہے کو ودیعت ہوئی ہوگی کہ بہ یک وقت کئی زمینوں کو لے کر چلے اور کئی آسمانوں کی سیر کرتا جائے۔ یہ مہارت بیشک معصوم شرفی اسیؔر کو حاصل ہے۔پاکستان کے شعیب اختر (راولپنڈی اکسپریس) کو دنیا کا سب سے تیز رفتار بالر مانا جاتا ہے،مگر کرکٹ کی دنیا میں ایسا کوئی ماں کالعل آج تک پیدا نہیں ہوا جس کی پھینکی ہوئی گیند ایک ہی وقت میں پورب پچھم، اتر دکھن ہرطرف قلابازی کھاتی ہوئی نشانے کی طرف جائے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ معصوم کی شاعرانہ بانگ کچھ اسی انداز کی ہےاور بانگ جب ایسی ہوتو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بلے باز کی کیا حالت ہوگی۔معصوم کے مجموعہ کلام 'شعلوں کے پھول' ترتیب دینے میں میرے چھکے چھوٹ گئے۔''

(شعلوں کے پھول، چھکے چھوٹ گئے،ص۹وص۱۰)

محمد یونس ہرگانوی کا کلام اپنے وقت کے سنجیدہ موضوعات و مسائل کا ترجمان اوران پر بے لاگ تبصرہ ہوتا تھا،لیکن طنز ومزاح کے حوالے سے بھی کئی جگہ انہوں نے کام لیا ہے۔اس ضمن میں ''میٹھی نوک جھونک'' کے تحت محمد نیاز (روزنامہ سنگم کے اس وقت کے قطعہ نگار) اوران کے شعری نوک جھونک کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔طنز ومزاح کی صورت نظم ''سیدھا رخ''، میں دیکھی جاسکتی ہے۔''واہیات''، مشہور شاعر رضا نقوی واہیؔ کی رحلت کے بعد اظہارغم کا معاملہ ہے،لیکن یونس ہرگانوی نے

واہی کی رعایت سے اس نظم میں طنز ومزاح سے اچھا کام لیا ہے۔اسی طرح ایک نظم ''چھینک'' ہے۔ یہ نظم ماہنامہ ''مسرت'' جنوری ۱۹۶۷ء میں چھپی تھی۔ یعنی نظم بچوں کے لئے ہے، لیکن مزاح غالب ہے۔نظم ''پالیٹکس نامہ'' طنزیہ مزاحیہ افکار لئے ہوئے ہے۔''رمضانی رپورٹ'' ایسی ہی فضا رکھتی ہے۔محمد یونس ہرگانوی نے نظموں کے ذریعہ حالات کی نہ صرف عکاسی کی ہے بلکہ ان حالات پر جذبات واحساسات کے ذریعہ تبصرہ بھی کیا ہے۔سماج کی مختلف کج رویوں کا ذکر اور اصلاح کی فکر بھی ان نظموں کا خاصہ ہے۔

نظموں کے علاوہ انہوں نے متعدد غزلیں بھی لکھی ہیں۔ ''اماوس کے تارے'' میں ان کی نظموں کے ساتھ غزلیں بھی شامل ہیں۔ غزلوں میں روایت کا حسن واضح ہے۔چند اشعار دیکھیں ؎

شمار ڈیڑھ ارب اور وزن جھاگ سمان
یہ کیفیت ہے جو دل کو اداس رکھتی ہے

کوئی شوخی بھی نہیں تیرے سخن میں یونسؔ
دل میں چبھتے بھی ہیں اشعار یہ کیا بات ہوئی

آدمی کون کون غم کھائے
غم بھی تو بے حد و حساب ہے آج

دشت جنوں کے بعد ہی منزل تھی شوق کی
دشت جنوں میں کھوئے تو نکلے نہ واں سے ہم

گوشے میں تھے قفس کے تو یاد آتا تھا چمن
دو دن چمن میں رہ کے نہ بھولے قفس کو ہم

یہ ہے میدان عمل اور وہ میزان عمل
آج پر زور ہے بس کل کی خبر کچھ بھی نہیں

دشت صحافت کی سیاحی نے ان کو ملّی اور ملکی حالات کے اتار چڑھاؤ سے ہمیشہ قریب رکھا، لہٰذا اصلاح وتبلیغ کا پہلو ان کی شاعری اور صحافت دونوں جگہ غالب رہا۔وہ خود کہتے ہیں ؎

اب اسے کوئی شاعری سمجھے کہ صحافت
کچھ حوصلہ بے حوصلہ لوگوں کو دیا ہے

محمد یونس ہرگانوی کی شاعری عموماً پٹنہ کے روزناموں خصوصاً ''سنگم'' تک محدود رہی۔شاید اسی سبب اہل نظر کی نظر اِدھر نہ جاسکی اور پھر یہ بھی کہ ان کا مجموعہ کلام، ان کی زندگی میں نہیں، بلکہ ان کے انتقال کے دو سال بعد ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا، یہی وجہ ہے کہ وہ تمام تر شاعرانہ صلاحیتوں کے باوجود شہرت کے میدان میں اپنا حق نہ پاسکے۔

محمد یونس ہرگانوی فارسی کے استاد تھے، لہٰذا انہوں نے طلبہ و طالبات کے لئے فارسی کی کئی کتابیں، کتابچے ترتیب دیئے یہ اور بات ہے کہ ان پر ان کا نام نہ ہوتا تھا۔ انہوں نے انجمن حمایت اسلام لاہور کی مشہور کتاب ''فارسی کی پہلی کتاب'' کو اپنے طور پر تصحیح و ترتیب کے بعد ''بک امپوریم'' پٹنہ سے شائع کرایا۔بطور مثال ابن یمین کا قطعہ مع ترجمہ دیکھیں ؎

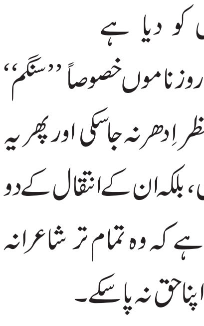

مرد باید کہ ہر کجا باشد
آدمی کو چاہئے کہ جہاں بھی رہے
عزت خویشتن نگہ دارد
اپنی عزت کا خیال رکھے
خود پسندی و ابلہی نکند
غرور اور بے وقوفی نہ کرے
ہر چہ کبر و منی است گذارد
جو بھی تکبر اور گھمنڈ ہے اسے چھوڑ دے
ہمہ کس راز خویش بہ داند
ہر شخص کو اپنے سے اچھا جانے
ہیچ کس را حقیر نشمارد
کسی کو حقیر (کم رتبہ) نہ شمار کرے

(فارسی کی پہلی کتاب مع ترجمہ، محمد یونس ہرگانوی، ص ۶۲)

محمد یونس ہرگانوی کے ساتھ کام کرنے والے اور بہت قریب سے جاننے

والے مشہور صحافی جناب خورشید پرویز صدیقی اپنے کالم ''شذرات'' میں ان کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''یونس ہرگانوی صاحب یعنی میرے استاد اردو پر کامل دست رس رکھتے تھے۔ فارسی کا بھی علم رکھتے تھے، لیکن اس کے متعلق ہم کوئی دعویٰ نہیں کر سکتے ہیں۔ غلام سرور کے قلم سے کبھی کوئی خاص تحریر نکلتی تو مجھے بلا کر دیتے کہ 'یونس صاحب سے دکھلا کر آیئے' استاد کبھی کبھار نوک پلک درست کرتے اور کبھی بغیر قلم لگائے واپس کر دیتے۔ غلام سرور صاحب پہلی بار جیل گئے تو اس کی روداد انہوں نے 'گوشے میں قفس کے' عنوان سے لکھی۔ چھپنے سے قبل انہوں نے اس کی زبان پروفیسر عبدالمغنی سے درست کرائی تھی۔ یہ بات شاید ہی کسی کو معلوم ہو۔ اُستاد اور ہم ایک معاملہ میں ایک تھے۔ ہم دونوں غلام سرور کی بہت عزت کرتے تھے، لیکن ان سے دبتے نہیں تھے اور نہ آفس کے دوسرے لوگوں کی طرح ان کے دربار کی رونق بڑھاتے تھے۔ ہم دونوں اپنا کام کرتے تھے، اسی لئے ہم دونوں ان کی گڈ بک میں کبھی نہیں رہے۔'' (یونس ہرگانوی: میرے استاد، روزنامہ فاروقی تنظیم، پٹنہ، ۲۴/اپریل ۲۰۲۴ء)

اوراب اس مضمون کا اختتام میں بھی خورشید پرویز صدیقی کی عبارت ہی پر کرتا ہوں، جس میں محمد یونس ہرگانوی کی خلوص مندی اور صلاحیت کے تعلق سے وہ رقم طراز ہیں:

''اُستاد بہت باصلاحیت آدمی تھے جس کا وہ بھول کر بھی اظہار نہیں کرتے تھے۔ ان کے سامنے وہ ڈینگیں مارتے رہتے تھے، جو اُن کے مقابلے میں کچھ نہیں تھے، لیکن وہ مسکرا کر اور بڑے خلوص سے انہیں اور ان کی باتوں کو برداشت کرتے رہتے تھے۔ یونس ہرگانوی صاحب بہت اچھے شاعر بھی تھے، لیکن انہوں نے کبھی اپنا کلام کسی کو نہیں سنایا، نہ کہیں شائع کرایا اور نہ کبھی کسی مشاعرے میں شرکت کی۔ اگر یادداشت دھوکہ نہیں دے رہی ہے تو یاد آتا ہے کہ انہوں نے ہم سے اپنی چند فارسی غزلوں کا بھی ذکر کیا تھا۔ استاد نام نمود اور شہرت سے بہت بھاگتے تھے۔ یونس ہرگانوی صاحب جیسے نیک، شریف، سادہ لوح، بے غرض، پرخلوص اور باصلاحیت لوگوں کی پیدائش کا سلسلہ بند ہو چکا ہے۔ آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے۔'' (یونس ہرگانوی: 'میرے استاد روزنامہ فاروقی تنظیم، پٹنہ، ۲۴/اپریل ۲۰۲۴ء)

❁❁❁

نہایت ضروری

☆ قلم کار حضرات! ''زبان وادب'' کو تخلیقات سے نوازنے کا شکریہ! اکادمی اشاعت یافتہ تخلیقات کا معاوضہ براہ راست آپ کے اکاؤنٹ میں بھیجتی ہے، اس لئے آپ تخلیقات کے ساتھ اپنا وہ نام انگریزی میں ضرور لکھیں جو بینک اکاؤنٹ میں ہے۔ بینک کا نام و پتہ، اکاؤنٹ نمبر اور IFS Code بھی تحریر کریں۔ آپ کا موبائیل نمبر اور مکمل پتہ بھی ضروری ہے۔ یہ تمام تفصیلات نہ ہونے کی صورت میں آپ کی تخلیق پر غور کرنے سے ہم قاصر ہوں گے۔

☆ ہمارے کرم فرما حضرات انٹرنیٹ سے اپنی تخلیقات بھیجتے ہوئے بھی مذکورہ باتوں پر دھیان دیں۔ بسا اوقات تخلیق کار نام بھی منسلک نہیں ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی اشاعت ممکن نہیں ہو پاتی۔ از راہ کرم ان گزارشوں پر لازماً توجہ رکھیں۔

☆ جو حضرات اب تک مذکورہ تفصیلیں نہ بھیج سکے ہوں، وہ بھی اس اعلان پر نگاہ عنایت فرمائیں۔ شکریہ!

ثناءاللہ ثنادوگھروی
C/o "Book Emporium" Sabzibagh, Patna-800004

ناشادؔ اورنگ آبادی: یادیں اور باتیں

اردو ادب سے محبت کرنے والی بے شمار ایسی ہستیاں بھی ہوئیں، جنہوں نے تن من دھن سے اردو ادب کی خدمات انجام دیں اور آخری سانس تک اردو ادب کی زلفیں سنوارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور اس طرح فکروفن کی بساط پر اپنی کاوشوں کے ایسے انمٹ نقوش ثبت کئے کہ آنے والی نسلیں تا دیر ان سے فیض حاصل کرتی رہیں گی۔ ناشادؔ اورنگ آبادی کا بھی شمار بلا شبہ ایسی ہی شخصیتوں میں کیا جائے گا، جنہوں نے اردو ادب کی خدمت کو اپنے اوپر فرض کرلیا تھا۔ وہ تا حیات کچھ کھونے اور کچھ پانے سے بے پرواہو کر بے لوث خدمت کرتے رہے، جس کا ذکر موصوف نے خود ہی اپنے ایک شعر میں کیا ہے۔

فرض سمجھ کر خدمت اردو کرتا آیا ہوں ناشادؔ
مجھ کو اس کی فکر نہیں کچھ کیا کھویا کیا پایا ہے

ناشادؔ اورنگ آبادی کا اصل نام محمد عین الحق خاں تھا۔ ان کی ولادت ۱۵ر جنوری ۱۹۳۵ء کو اورنگ آباد میں ہوئی تھی۔ وہ محکمہ ریلوے میں ملازم تھے۔ سبکدوشی کے بعد مستقل عظیم آباد میں قیام پذیر ہوئے اور اس انداز و ادا کے ساتھ ہوئے کہ شہر عظیم آباد میں شعروسخن کی کوئی محفل آراستہ کی جائے اور موصوف کی اس میں شرکت نہ ہو، ایسا بہت کم ہی ہوا۔

ناشادؔ اورنگ آبادی نہایت ہی ملنسار اور خلیق انسان تھے۔ وہ سب سے نہایت ہی خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ وہ ملنے ملانے میں چھوٹے بڑے کے ساتھ بہت زیادہ فرق نہیں رکھتے تھے۔ وہ جس طرح

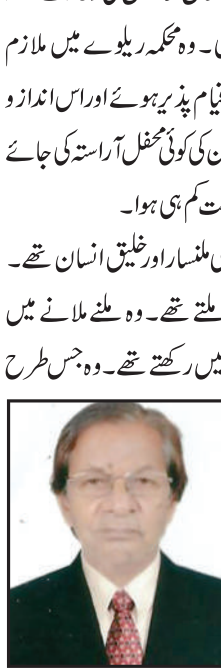

اپنے ہم عمروں سے خلوص اور پیار سے ملتے تھے، اسی طرح وہ اپنے عزیزوں سے بھی بہت مشفقانہ رویہ کا اظہار کرتے ہوئے، مسکراتے ہوئے ملتے تھے۔ وہ اپنے عزیزوں کو بھی گاہے بگاہے یاد کرتے، ان کی خیریت دریافت کرتے اور انہیں دعاؤں سے نوازتے، یہ ان کا شیوہ تھا۔ میرے ساتھ بھی ان کا رویہ کچھ ایسا ہی رہا۔ میری جب بھی ان سے ملاقات ہوئی وہ مسکراتے ہوئے ملے۔ وہ کبھی کسی غم کو اپنے اوپر حاوی ہونے نہیں دیتے تھے۔ ان کا چہرہ ہمیشہ ہشاش بشاش نظر آتا تھا اور چہرے سے ایک طرح کی طمانیت جھلکتی تھی، کیفؔ بھوپالی کا ایک شعر ہے جو ناشادؔ اورنگ آبادی کی شخصیت پر خوب خوب صادق آتا ہے۔

میں نے دریا سے سیکھی ہے پانی کی پردہ داری
اوپر اوپر ہنستے رہنا گہرائی میں رو لینا

میں یہ نہیں کہتا کہ وہ کبھی غمگین ہوئے ہی نہیں ہوں گے، کیوں کہ انسانی زندگی میں خوشی اور غم دونوں کا وجود ہے اور ان دونوں کے اثرات انسانی زندگی پر مرتب ہوتے ہیں۔ انسان اپنی زندگی میں کبھی نہ کبھی ان دونوں سے متاثر ہوتا ہے۔ کچھ لوگ زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور کچھ لوگ کم۔ کچھ لوگوں کا غم دور ہی سے جھلکتا ہے، مگر کچھ لوگوں کا غم باہر سے نظر نہیں آتا اور نہ ہی وہ دوسروں پر ظاہر ہونے دیتے ہیں۔ بس اندر ہی اندر ان کا غم انہیں کھاتا ہے۔ ایسی ہی شخصیتوں میں ناشادؔ اورنگ آبادی بھی تھے۔

میری جب ان سے ملاقات ہوئی اور میں ان کے رابطے میں آیا، اکثر و بیشتر ان کا فون میرے پاس ضرور آجاتا تھا۔ کبھی تو کوئی کام ہوتا یا کسی سلسلے میں کوئی بات پوچھنی ہوتی تھی خبروں کے تعلق سے اور کبھی بلاغرض فون کرتے تھے، بلکہ زیادہ تر ان کا فون بلاغرض ہی آتا تھا جب میں ان سے خیریت دریافت کرنے کے بعد پوچھتا:

’’محترم! فرمائیے، کیا حکم ہے......؟‘‘

تو ان کی جانب سے مسکراتے ہوئے انداز میں جواب ملتا:

’’ثنا صاحب کوئی کام نہیں ہے، آپ سے بات کئے بہت

دن ہوگئے تھے،سوبس خیر خیریت کے لئے فون کیا ہے۔'' اور میں ان سے گفتگو کے بعد اندر ہی اندر بہت شرمندگی محسوس کرتا تھا کہ کاش یہ فون میں نے انہیں کیا ہوتا اور ان کی خیریت دریافت کی ہوتی۔گفتگو کے دوران میں اپنے کسی کلام کے متعلق بھی ان سے ان کے تاثرات پوچھتا اور وہ میرے کلام کو سراہتے اور جی بھر کے حوصلہ افزائی کرتے۔

ناشاؔد اورنگ آبادی سے میری اس قربت کا سہرا دراصل روزنامہ ''انقلاب'' پٹنہ کے ماہانہ طرحی مشاعرہ ''بزم انقلاب'' کو جاتا ہے۔ یہ کوئی ۲۰۱۲ء کی بات ہے، جب میری تحریک پر روزنامہ ''انقلاب'' پٹنہ کے اس وقت کے ریزیڈینٹ انچارج جناب احمد جاوید نے ''بزم انقلاب'' کے نام سے روزنامہ ''انقلاب'' کی جانب سے ماہانہ طرحی مشاعرے کا آغاز کیا تھا جس میں ہر ماہ ادارے کی جانب سے مصرع طرح دیا جاتا تھا جس پر شعرائے کرام طبع آزمائی کرتے اور ریاست کے دور دراز علاقوں سے سفر کی ہزار صعوبتیں برداشت کرکے مشاعرہ میں شرکت کے لئے وقت مقررہ پر پہنچ جاتے۔

اس ''بزم انقلاب'' کا پہلا مشاعرہ جو قدوائی پوری میں پٹنہ ویمنس کالج پٹنہ کے عقب میں واقع روزنامہ ''انقلاب'' کے دفتر میں منعقد ہوا تھا، اُس کی صدارت ناشاؔد اورنگ آبادی نے ہی کی تھی۔ اس مشاعرے میں مرحوم حسن نواب حسنؔ اور ناشاؔد اورنگ آبادی اغل بغل میں تشریف رکھتے تھے۔ چوں کہ ناشاؔد اورنگ آبادی صاحب زیادہ بزرگ تھے، اس لئے احمد جاوید صاحب نے انہیں مشاعرے کی صدارت کے لئے دعوت دی اور دیگر شرکائے مشاعرہ نے اس کی پر خلوص انداز میں تائید کی۔ ہم لوگوں نے بڑی ہی خوش اسلوبی کے ساتھ کم و بیش پانچ سال اس سلسلہ کو قائم رکھا۔

ناشاؔد اورنگ آبادی کو اگرچہ پہلے سے میں جانتا تھا، لیکن

''بزم انقلاب'' کی طرحی نشست کے بعد سے ان سے میری قربت اور بھی بڑھ گئی۔ وہ بھی مجھے اپنا عزیز سمجھتے تھے اور میرے ساتھ اسی انداز میں پیش آتے تھے۔ ''بزم انقلاب'' کے پہلے مشاعرے کی صدارت کے بعد بھی گاہے بگاہے انہوں نے اس بزم کے کئی مشاعروں کی صدارت کی اور اردو روزنامہ ''انقلاب'' کے اس تاریخی قدم کے حوالے سے اپنے بیش قیمتی تاثرات سے بھی نوازا۔

ادھر چند سال قبل ہم لوگوں کی نئی ادبی تنظیم کے مشاعرے میں بھی جسے ہمارے دیرینہ رفیق ڈاکٹر توقیر عالم توقیر (اسسٹنٹ پروفیسر مولانا مظہرالحق یونیورسیٹی، پٹنہ) نے قائم کیا ہے اور جس کے جنرل سکریٹری بھی وہی ہیں، ناشاؔد اورنگ آبادی نے کئی بار شرکت کی اور اس تنظیم کے حوالے سے بھی ان کے بڑے اچھے تاثرات رہے اور تنظیم و تنظیم کے ارکان کو دعاؤں سے نوازا۔

ناشاؔد اورنگ آبادی کی شاعری کی عمر کم و بیش نصف صدی پر محیط ہے۔ انہوں نے یوں تو نظمیں بھی خوب کہی ہیں، لیکن غزلوں میں ان کی اپنی ایک شناخت ہے، کیوں کہ غزل سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔ ان کے کئی مجموعے منظر عام پر آکر ادبی حلقے سے داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام ''پرواز سخن'' ۱۹۹۰ء میں بہار اردو اکادمی کے مالی تعاون سے، دوسرا مجموعہ کلام ''میل کا پتھر'' ہندی رسم الخط میں ۱۹۹۱ء میں، تیسرا مجموعہ کلام ''لمحے لمحے کا سفر'' ۲۰۰۹ء میں راج بھاشا اردو، بہار، پٹنہ کے مالی تعاون سے اور ۲۰۱۷ء میں ''رخت سفر'' (شعری مجموعہ) بہار اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہوا۔ ۲۰۰۹ء میں ہندی رسم الخط میں ان کی کتاب ''ہم سفر غزلیں'' شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ ''غزل کیسے لکھیں'' کے عنوان سے ایک کتاب موصوف کی ادارت میں شائع ہوئی جس میں غزل کے حوالے سے دانشوران اردو ادب کے مضامین اور ہندی اردو شعرا کی غزلیں شامل ہیں۔

شعر و سخن کے شعبے میں ناشاؔد اورنگ آبادی عظیم المرتب شخصیت کے مالک تھے اور لوگوں میں ان کی شخصیت بڑی مقبول تھی، ادبی دنیا میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شعر و سخن کے شعبے میں ان کی خدمات کے لئے انہیں ریاست اور بیرون ریاست مختلف اداروں

اور تنظیموں نے متعدد اعزازات وانعامات سے بھی نوازا۔

۱۹۹۱ء میں ساہتیہ کار سنسد سمستی پور نے انہیں ان کے مجموعہ ''پروازِ سخن'' اور میل کا پتھر'' کے لئے شیوساگر مشرا ایوارڈ سے اور ۱۹۹۲ء میں ہندی کی ایک تنظیم ''ابھویکتی'' دل سنگھ سرائے نے ''وی بھوشن ایوارڈ'' سے نوازا۔ فرید آباد ہریانہ کی تنظیم ''پریاس'' کی جانب سے ۱۹۹۸ء میں اعزاز سے نوازے گئے۔ نومبر ۲۰۰۰ء میں عالمی ہندی کانفرنس میں ملینیم ایوارڈ سے نوازے گئے۔ ۲۰۰۱ء میں سلبھ انٹرنیشنل ساہتیہ اکادمی دہلی کے ذریعہ ادبی ایوارڈ سے نوازے گئے۔ ۲۰۰۳ء میں سمستی پور کے ریلوے ہائی اسکول میں منعقد کل ہند کوی سمیلن اور مشاعرہ میں ڈی آر ایم سمستی پور نے کیفی اعظمی ایوارڈ سے نوازا۔ ۲۰۰۴ میں کسم پانڈے سنستھان سمستی پور کی جانب سے ''مرزا غالب'' ایوارڈ سے نوازے گئے۔ ۲۰۰۵ میں ہریانہ کے ایک ادبی ادارہ ''جیمنی اکادمی'' نے پدم شری سوہن لال ایوارڈ سے نوازا۔

مذکورہ ایوارڈ کے علاوہ شاؔد اسٹڈی سرکل کی جانب سے ''شاؔد عظیم آبادی ایوارڈ'' سے، ۲۰۱۰ء میں ''خاموش سرحدی ایوارڈ'' سے ۲۰۱۱ میں، مدرٹریسا سوسائٹی پٹنہ کی جانب سے ''مدرٹریسا ایوارڈ'' سے، ۲۰۱۲ء میں ''توفیق فاروقی ایوارڈ'' سے نوازے گئے۔ ۲۰۱۳ء میں ساہتیہ کار سنسد نے ''ڈاکٹر ترون ایوارڈ'' سے نوازا۔ ۲۰۱۴ء میں بہار اردو اکادمی نے ''لمحے لمحے کا سفر'' کے لئے انعام سے نوازا۔ ۲۰۱۴ء ہی میں رضا نقوی واہؔی اکیڈمی علی نگر پٹنہ کی جانب سے ''رضا نقوی واہؔی ایوارڈ'' سے نوازے گئے۔ ۲۰۱۶ء میں بہار اردو اکادمی کی جانب سے بسمؔل عظیم آبادی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اکبر رضا جمشید اکیڈمی نے لائف اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے انعامات واعزازات ان کے حصے میں آئے جو مختلف تنظیموں اور اداروں کی جانب سے تھے۔

جہاں تک ناشاؔد اورنگ آبادی کی شاعری کا تعلق ہے، انہوں نے اپنے کلام میں اپنے احساسات وجذبات کو اس خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے کہ قاری کو لگتا ہے انہوں نے اپنے احساسات و جذبات کو غزل کی زبان عطا کر دی ہے۔ وہ شعر کہتے تھے اور خوب کہتے تھے۔ انہیں قدرت کی جانب سے شعر کہنے کا بہترین سلیقہ عطا ہوا تھا۔ وہ اپنے کلام میں جہاں معنویت پر توجہ دیتے تھے، وہیں ان کے اشعار میں ایک طرح کا حسن بھی دیکھنے کو ملتا ہے، ساتھ ہی زمانے کا عطا کیا ہوا درد و کرب بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کو اپنے عہد سے ہم آہنگ کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عصری حسیت کے عناصر ان کے یہاں جابجا دیکھنے کو ملتے ہیں ؎

کبھی میں دشمنوں کے خوف میں ناشاؔد رہتا تھا
مگر اب دوستوں نے مشکلوں میں ڈال رکھا ہے

یہ کس سماج کی تہذیب ہے کہ آپس میں
جو رام رام نہ ہو اور دعا سلام نہ ہو

مجھ کو بدنام کیا اور پشیمان کیا
خوب احسان فراموش نے احسان کیا

کل لپٹ کر میں سائے سے روتا رہا
دھوکے میں دوست اک گمشدہ مل گیا

ناشاؔد اورنگ آبادی کو نہ صرف زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی، بلکہ فن پر بھی بڑی پکڑ رکھتے تھے اس لیے مشکل زمین اور قوافی و ردیف میں بھی انہوں نے اشعار کہے ہیں۔ وہ چھان پھٹک کر لفظوں کا ٹھیک استعمال کرتے تھے۔ ان کے اشعار میں معنویت کا جہان آباد نظر آتا ہے۔ ان کی دو غزلیں کافی مشہور ہوئی تھیں، بھلے ہی ان میں تغزل نہ ہو، لیکن یہ دونوں غزلیں جس نوعیت کی ہیں، ویسی غزل اور اس قدر طویل غزل کہہ لینا ہی کمال کی بات ہے۔ انہوں نے ایک غزل کا عنوان دیا ہے ''تاریخی غزل'' اور دوسری کا عنوان ہے ''تاریخ کے آئینے میں'' دونوں غزلیں ان کے شعری مجموعہ ''رخت سفر'' میں شامل کی گئی ہیں۔ ''تاریخی غزل''، صفحہ نمبر ۲۱ سے شروع ہو کر صفحہ نمبر ۲۹ پر ختم ہوتی ہے، جو ۱۲۶ اشعار پر مشتمل ہے، جب کہ ''تاریخ کے آئینے میں'' صفحہ نمبر ۳۴ سے شروع ہو کر صفحہ نمبر ۳۸ پر ختم ہوئی ہے جس میں ۱۳۶ اشعار شامل ہیں۔ دونوں غزلیں الگ الگ زمینوں میں کہی گئی ہیں اور دونوں کے قافیے اور ردیف بھی مختلف ہیں۔ ان غزلوں میں سیکڑوں شعرا و ادبا کے نام شامل کئے گئے ہیں اور بڑی خوبصورتی سے انہیں برتا بھی گیا ہے، یہ ناشاؔد

اورنگ آبادی کی فن پر گرفت کا ہی نتیجہ ہے کہ وہ ایسی مشکل غزل کہہ سکے، ملاحظہ ہوں چند اشعار ۔

اردو زباں کو سیکڑوں لعل و گہر ملے
خسرو ، رضا و سید شاد و شرر ملے
آتش بھی شیفتہ بھی انیس و دبیر بھی
سب اپنے اپنے عہد کے شمس وقمر ملے
مغنی ،کلیم ، و رمز و عطا عاجز وسہیل
واہی کے ساتھ اور کئی معتبر ملے
فکری ، صبا و منظر و آزاد اور ثناء
شاعرادیب سب مجھے شیر وشکر ملے

میر نے مومن نے آتش نے داغ نے اس میں رنگ بھرا
ذوق و غالب کے گھر آ کر ہوگئی خوش افکار غزل

ناشاد ارونگ آبادی کی برسہابرس ریاضت کا نتیجہ تھا کہ انہیں فن میں کمال حاصل ہوا۔انہوں نے اردو شاعری میں ریاضت اوراس کے نتیجے میں فن پرگرفت کے تعلق سے کیا خوب کہا ہے ۔

فعلن فعلن خوب پڑھا ہے تب جا کر لکھ پایا ہوں
ورنہ کچھ آسان نہیں تھا کہہ لینا دشوار غزل

میں نے اردو روز نامہ ''انقلاب'' میں ناشاد اورنگ آبادی کی کتاب ''رخت سفر'' پرتبصرہ کرتے ہوئے ان کی شاعری کےحوالے سے لکھا تھا:

''ناشاد کی شاعری میں جہاں روایت کی پاسداری کے ثبوت ملتے ہیں، وہیں انہوں نے عصری تقاضوں سے بھی اپنی شاعری کو ہم آہنگ کرنے کی بھر پور کوشش کی ہے۔'رخت سفر' میں بیشتر اشعار ایسے ملتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ناشاد ایک دردمند دل رکھتے ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی فکر میں ایک طرح کے خلوص کا دریا موجزن ہے۔ان کی شاعری محبت ،اخوت ،انسانیت ، معاشرت ، اخلاقیات، زندگی کے نشیب و فرازاور حسرت وآرزؤں سے عبارت ہے۔''

ناشاداورنگ آبادی کےکلام میں محبت کے عناصر کی جابجامختلف رنگوں میں کارفرمائی نظرآتی ہےاور کیوں نہ ہو کہ اس تعلق سے میں پیشتر بھی ذکر کر چکا ہوں کہ وہ جب بھی کسی سے ملتے تھےتو کھلے دل سےاور خندہ پیشانی کے ساتھ مسکراتے ہوئے ملتے تھے کہ سامنے والا کسی غم میں بھی ہوتو تھوڑی دیر کے لیے اپنا غم بھول جائے۔یہ شخصیت تھی ناشاد اورنگ آبادی کی، جیسی ان کی شخصیت تھی ویسی ہی ان کی شاعری بھی ہے۔ان کی شخصیت کا عکس ان کی شاعری میں جگہ جگہ دیکھنے کو مل جاتا ہے۔انہیں اپنی تہذیب، اپنی مٹی،اپنے وطن سے اَتھاہ پیار تھااورسب سے بڑھ کر وہ ایک انسان دوست تھے،اس لیے انسانیت سے بھی انہیں محبت تھی جس کا اظہار یہ ان کی شاعری ہے۔ناشاد کی شاعری اوراس میں محبت کی کارفرمائی کے تعلق سے فردالحسن فرد رقمطراز ہیں:

ناشاد اورنگ آبادی نے کبھی دعویداری نہیں کی کہ میں ترقی پسند ہوں یا جدید۔ ان کا شیوہ صرف اورصرف محبت رہی۔ انسانیت سے محبت ،اردو سے محبت ، اپنی تہذیب وثقافت سے محبت ، اپنے وطن سے محبت ...... اوراسی محبت نے انہیں ناشاد رکھا ہے کہ ان خیموں کی طنابیں انہیں کمزور ہوتی ہوئی محسوس ہوئیں اورانسانیت دم توڑتی نظر آئی۔اردو سے محبت کے لئے اوران کے جذبے کو سمجھنے کے لئے ان کی ایک غزل کا مقطع ہی کافی ہے جس میں انہوں نے کھونے اور پانے سے لاتعلقی ظاہر کرتے ہوئے خود کوخادم اردو کے طور پر پیش کرتے ہوئے خود پراردو کی خدمت کوفرض گردانا ہے ۔

فرض سمجھ کر خدمت اردو کرتا آیا ہوں ناشاد
مجھ کو اس کی فکر نہیں کچھ کیا کھویا کیا پایا ہے

(فردالحسن فرد حرف آغاز''رخت سفر''ص ۲)

ناشاد کی شاعری میں جہاں ان کے عہد سے ہم آہنگ ہونے کی بھر پور صلاحیت موجود ہےاور جہاں ان کے یہاں زمانے کے دردوغم ،لوگوں کی بے راہ روی،اپنوں کا عطا کیا ہوا کرب یعنی عصری حسیت کے بہترے عناصر اپنی موجودگی درج کراتے ہوئے نظر آتے ہیں، وہیں وہ روایت

کی پاسداری میں بھی ناشادؔ کی شاعری پیچھے نظر نہیں آتی ۔

یہ برے دن ہیں تو ناشادؔ گزر جائیں گے
میں نے سیکھا ہی نہیں غم سے ہراساں ہونا

فخر ہے تجھ پہ مری جان غزل کہ تونے
جاکے کاشی میں مرے واسطے اشنان کیا

کبھی شعلوں پہ چلوایا گیا ہوں
کبھی پانی کو ترسایا گیا ہوں
زمیں کرتی ہے میرا خیر مقدم
کہ میں جنت سے ٹھکرایا گیا ہوں

کچھ امیدیں تھیں وابستہ جس ذات سے
وہ بھی اغیار سے بے وفا مل گیا

ناشادؔ اورنگ آبادی کا کلام جہاں محبت، اخوت، انسانیت، معاشرت، اخلاقیات، زندگی کے نشیب وفراز اور حسرت وآرزوؤں سے عبارت ہے، وہیں ان کے افکار ونظریات میں خلوص ووفا، عاجزی وانکساری کا دریا بھی موجزن نظر آتا ہے۔ ان کے کلام کے مطالعے سے ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے انہوں نے ایک طویل عرصہ پر محیط اپنے تجربات ومشاہدات کو اشعار کا ایسا خوبصورت جامہ پہنا دیا ہے جس میں اعلیٰ افکار ونظریات کے ساتھ شعریت اور فنی رچاؤ بھی پایا جاتا ہے۔ ناشادؔ کے یہاں بیشتر ایسے اشعار مل جاتے ہیں، جن کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی شاعری سہل ممتنع کی بہترین مثال ہے۔ ناشادؔ نے جہاں آسان بحروں میں غزلیں کہی ہیں، وہیں طویل اور مشکل بحروں میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے یہاں خیالات کی پاکیزگی ہے اور ان کی شاعری میں ایک پرکیف فضا دیکھنے کو ملتی ہے۔ ناشادؔ کی شاعری کے تعلق سے پروفیسر علیم اللہ حالیؔ کچھ یوں رقمطراز ہیں:

''ناشادؔ کی شاعری میں ایسی کئی پنہاں وظاہر خوبیاں ہیں جو اہل نظر سے خراج توصیف حاصل کرلیتی ہیں۔ اول تو یہ ہے کہ شعری اظہار میں ان کی سادگی وبے ریائی، عدم تصنع اور راست اظہار جذبات کی خوبی قارئین کو متاثر کرتی ہے۔ بات اگر دل سے نکلتی ہو تو اسے دل تک پہنچانے کے لئے لفظی آرائش وزیبائش کی ضرورت نہیں پڑتی۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ناشادؔ اورنگ آبادی نے غزلیہ شاعری کو حدیث ذات تک محدود رکھنے میں ہی اس کی حرمت وعظمت محسوس کی ہے۔ غزل جب اپنی ذات سے الگ ہوجاتی ہے تو اس کے بازاری ہوجانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ ہنرمند فنکار یہ جانتا ہے کہ کائنات کو ذات میں کس طرح سمیٹا جاتا ہے۔ اچھی غزلیہ شاعری میں ۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

والی کیفیت ہوتی ہے جہاں کائنات کا درد اپنی ذات کا اَلم بن کر دوآتشہ بن جاتا ہے اور فنکار کی پوری شخصیت کا کوائف نامہ ہوجاتا ہے۔ ناشادؔ اورنگ آبادی کا مطالعہ انہیں امتیازی اوصاف کی روشنی میں کرنا چاہئے۔''

(پروفیسر علیم اللہ حالیؔ، فلیپ اول 'رخت سفر')

ناشادؔ اورنگ آبادی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں، لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ انہوں نے صرف غزلیں ہی کہی ہیں۔ انہوں نے غزلوں کے علاوہ مختلف موضوعات پر نظمیں بھی کہی ہیں اور دوہے اور قطعات بھی لکھا ہے۔ ان کی نظموں میں ''قومی گیت'' ایک نہایت عمدہ نظم شمار کی جاتی ہے، اس میں جہاں حب وطن کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، وہیں اس وطن کی آب وہوا، یہاں کے دریا، یہاں بسنے والی قومیں، یہاں کے بزرگان دین اور صوفیوں وسنتوں اور رشی منویوں، مجاہدین آزادی اور اس ملک کی تعمیر میں اپنا خون پسینہ ایک کرنے والے رہنماؤں کا تذکرہ بھی بڑے حسین پیرائے میں کیا گیا ہے ۔

چشتی نانک جین وگوتم سب تھے بڑے مہان
امن واماں کی شکچھا دیتے 'گیتا' اور 'قرآن'
'گروگرنتھ صاحب' کا بھی ہے ایسا ہی فرمان
میرا پیارا ہندوستان ، میرے خوابوں کا جہان

اسی طرح ایک اور نظم ''قومی ایکتا'' ہے جس کے ذریعہ اتحاد واتفاق اور

مساوات کی دعوت دی گئی ہے اور قومی ایکتا یعنی اتحاد اتفاق کو قائم کرنے اور اس کے پھیلانے پر زور دیا گیا ہے۔ ان کی ایک عمدہ پیامی نظم ''قومی یکجہتی'' کے نام سے بھی ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

نظموں کے علاوہ انہوں نے بہترے قطعات بھی کہے ہیں اور بڑی کامیابی اور حسن کے ساتھ کہے ہیں۔ ان قطعات میں زیادہ تر قطعات سانحہ ارتحال سے تعلق رکھتے ہیں جن میں متوفیوں کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ ان قطعات میں مہاتما گاندھی، مظہر امام، منشی پریم چند، سجاد ظہیر، جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری کے ساتھ شاد عظیم آبادی، حفیظ جالندھری اور شاد اس فاروقی وغیرہم کے نام شامل ہیں۔ ناشاد اورنگ آبادی نے دوہا نگاری میں بھی الفاظ کا برمحل استعمال کر کے اپنے کلام کو حسن و معنویت اور عروضی اعتبار بخشا ہے۔

مختصر یہ کہ ناشاد اورنگ آبادی کی نظمیں ہوں یا غزلیں دونوں میں انہوں نے اپنی فنی مہارت کا سکہ بٹھانے کی کوشش کی ہے۔

اس طرح ان کی شاعری کے تعلق سے یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں غزل کے وقار پر کہیں آنچ نہیں آنے دی اور تا حد امکان نظم اور دیگر انواعِ سخن کے سرمائے میں بھی قابل لحاظ اضافے کرتے رہے۔ ان کی شاعری جہاں عام لوگوں میں مقبول تھی وہیں ناقدین ادب اور دانشوران نے بھی ان کی شاعری کو سراہا۔

ناشاد اورنگ آبادی نے تقریباً نوے سال عمر پا کر ۱۸ جون ۲۰۲۳ء کو پٹنہ کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں شام کے تقریباً سات بجے آخری سانس لی۔ تجہیز و تدفین آبائی قبرستان امجھر شریف، ہسپورہ (اورنگ آباد) میں عمل میں آئی۔ یہ تو سچ ہے کہ وہ اب ہمارے درمیان نہیں، مگر اسی کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ ناشاد جیسا دیدہ ور فن کار کسی معاشرے میں مدتوں بعد آتا ہے۔ بلاشبہ وہ انہیں شخصیتوں میں تھے جن کے لئے کہا گیا ہے کہ ''بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا''

❀❀❀

ناشاد اورنگ آبادی کی شاعری

عین الحق ناشاد اورنگ آبادی نے اگرچہ حمد و نعت اور منقبت کی شکل میں تقدیسی شاعری بھی کی ہے اور رنگارنگ موضوعات پر نظمیں بھی لکھی ہیں اور یہ کہنا بھی اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ وہ مذکورہ اصناف کے ایک اچھے اور کامیاب شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت بناتے ہیں۔ ان کی حمدیہ شاعری میں مناجاتی رنگ خاص طور سے متوجہ کر لیتا ہے اور کچھ اسی طرح ان کی نعتیہ اور منقبت بداماں شاعری بھی یہ احساس دلاتی ہے کہ وہ بہر صورت عقیدے اور عقیدت کے فرق سے آگاہ ہیں اور حفظ مراتب کا پاس و لحاظ رکھنے میں انہوں نے ذرا بھی غفلت سے کام نہیں لیا ہے۔ ان کی نظمیں تازہ عصری موضوعات اور خصوصاً اردو کی محبت کے بیان سے آراستہ و پیراستہ ہیں، ساتھ ہی ساتھ ان کی موقتی تاثراتی شاعری بھی اپنا ایک موثر رنگ و آہنگ رکھتی ہے، لیکن ان ساری خوبیوں کے باوجود یہی کہنا انسب ہے کہ حضرت ناشاد کا اصل جوہر سخن ان کی غزلیہ شاعری کے مطالعہ ہی سے نکھر کر سامنے آتا ہے۔ ان کے یہاں روایت و بصیرت کا حسین امتزاج ملتا ہے اور ان کی غزلیں اگر ایک طرف رومانی اور عشقیہ کہلانے کی حقدار ہیں تو دوسری طرف وہ عصری مسائل اور عصری آگہی کے اوصاف سے بھی متصف دکھائی دیتی ہیں اور اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ محض کلاسیکی اور روایتی شاعری کے دلدادہ نہیں بلکہ ذہنی کشادگی اور فراخ قلبی کے ساتھ غزلیں کہنے والے فن کار ہیں۔ انہیں اگرچہ اس بات کا پورا شعور ہے کہ ''دنیائے شاعری بہت عمیق ہے'' اور ''سب کی قسمت میں نہیں شاعر دوراں ہونا'' لیکن پھر بھی انہوں نے اپنی کاوشوں میں کوتاہی نہیں برتی ہے، لہٰذا ان کی غزلوں میں عصری حسیت اور سماجی و تہذیبی تجزیے کا بیان بڑی ہی خوبصورتی سے آ گیا ہے۔ ان کی غزلوں میں استعاراتی جلووں کے ساتھ رجائیت، ذہنی تحریک، اخلاق و نصیحت اور پیام امن و اتحاد کے عناصر بہر صورت موجود ہیں۔ انہوں نے ''قلم کے زور سے لاکھوں میں نام پیدا'' کرنے کی تلقین کی ہے اور بڑی خوبصورتی اور تہداری کے ساتھ ان چہروں کی پہچان کرادی ہے جو وقت اور تجربے کی کسوٹی پر ہمیشہ کھوٹے ہی اترتے ہیں اور احسان فراموشی میں طاق ہوتے ہیں۔ شاعری زندگی اور زمانے کے گر سکھاتی ہے اور مسرت و مسکان بھی دیتی ہے اور ان پہلوؤں سے ناشاد اورنگ آبادی کی شاعری اور خصوصاً غزلیہ شاعری واقعی کچھ ایسی ہے کہ ''زمانہ بھول نہ پائے گا اس کو صدیوں تک۔'' (ماخوذ)

افسانے

رفیع حیدر انجم
Gachhi Tola, Ward No. 24, Araria - 854311 (Mob. 8002058079)

کھنڈروں میں بسے ہوئے لوگ

چائے کے دوران باتوں باتوں میں اس اجنبی شخص نے اپنی جیب سے ایک عجیب وغریب شے نکال کر میز پر رکھ دی۔

''ہونٹوں کو رنگنے کے لئے ،لپ اسٹک۔'' وہ مسکرایا۔

''لپ اسٹک......؟'' میں نے حیرت اور خوف کی سنسناہٹ اپنی نسوں میں محسوس کی اور نفرت کا ننگا تار اس کے جسم سے سٹا دیا۔

''وائلڈ سوائن۔''

''صرف باہر سے...... خول ہٹاتے ہی اندر سے سرخ سرخ، خوشبودار......'' نفرت کے ننگے تار پر سکون و اطمینان کا خول چڑھاتے ہوئے وہ لپ اسٹک کی خوبیاں گنانے لگا، پھر اس نے اپنی بائیں آنکھ دبا کے بڑی راز داری سے کہا:

''شہر کی اونچی عمارتوں میں اس کا ڈیمانڈ بڑھتا جا رہا ہے۔''

''اور کھنڈروں میں......؟'' میری آواز کیسٹ کے بے ہنگم شور سے ٹکرا کر ٹوٹ پھوٹ گئی۔

''تم کھنڈروں میں بسے ہوئے لوگوں کو نہیں جانتے۔''

اس نے جلدی جلدی چائے کے لمبے لمبے گھونٹ بھرے اور مزید کچھ کہے بغیر ریستوراں سے باہر نکل آیا۔

مجھے لپ اسٹک سے کوئی چڑھ نہیں ہے، مگر یہ کیا......؟ شکل و شباہت سے جنگلی سور، سانپ اور بچھو نظر آئے۔ آخر کسی چیز کی اپنی مخصوص شناخت تو ہونی چاہئے، ورنہ اچھی چیزوں کا بھی سارا حسن زائل ہو جاتا ہے، لیکن ابھی ابھی اس نے اونچی عمارتوں کا ذکر کیا تھا۔ اس شہر کی اونچی عمارتیں تو انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں اور کھنڈر...... چائے کا بل ادا کر کے باہر نکلا تو محسوس ہوا شہر کا شہر ہی تبدیل ہو چکا ہے۔

کٹے پھٹے چہرے، زنگ آلود ہڈیاں، نچی ہوئی تحریریں، ٹوٹے پھوٹے ظروف، طلاق شدہ قدریں، خارج الوقت سکے، مصلوب آوازیں، مکروہ سانسیں اور......اور ملبے......ایک لمحہ کے لئے ایسا محسوس ہوا کہ میں موہن جوڈارو کی کھدائی سے حاصل شدہ کوئی صدیوں پرانا بت ہوں جسے اس شہر کے چوراہے پر نصب کر دیا گیا ہے۔ موہن جوڈارو یعنی مردوں کا شہر۔

مگر یہ میری نگاہوں کا وہم تھا۔ شام کی آنکھوں میں رات کا کاجل بھر چکا تھا اور شہر کا شہر سڑکوں پر امڈ آیا تھا۔ آفس اور کارخانوں سے لوٹتے ہوئے لوگ باگ، ٹرام اور بسوں پر چڑھتا اُترتا اژدہام، تھیٹروں کی دیواروں پر ٹنگی ہوئی نیم عریاں تصاویر، بجلی کے جلتے بجھتے رنگین قمقمے، فٹ پاتھ پر اُبلتی ہوئی جوانیاں، خوش شکل و خوش پوش بچے اور کٹھ پتلی کی طرح ناچتا ہوا ٹریفک کانسٹیبل۔

میں نے اپنے ذہن پر گرد و غبار کی موٹی تہہ محسوس کی اور سوچا کہ آج کچھ وقت یونہی سڑکوں پر بھٹکتے ہوئے گزار دوں۔

''روز مرہ استعمال کی اشیا میں بیس فیصد کی رعایت......''

کچھ قدم آگے بڑھا تھا کہ ایک اعلان سنائی دیا۔

بیس فیصد رعایت؟ مہنگائی کے دور میں اتنی رعایت بہت ہوتی ہے، مگر مجھے کس چیز کی ضرورت ہے؟......اس کا خیال آتے ہی بیک وقت کئی ضرورتیں اپنا سر اٹھانے لگیں، مگر تمام ضروریات تو پوری کی نہیں جا سکتیں۔ ہاں، کچھ لازمی اشیا فراہم کی جا سکتی ہیں۔

بہت دنوں سے میں نے روپا کے لئے کچھ نہیں خریدا تھا۔ میں لپک کر سامنے کے ایک اسٹور میں داخل ہو گیا۔ کاؤنٹر کے پیچھے شوکیس کے اندر ٹیوب لائٹ کی سفید روشنی میں قرینے سے سجی ہوئی چیزیں جگمگا رہی تھیں۔

''کیا پیش کروں جناب؟'' سیلز مین نے اپنی مسکراہٹ کی میزان پر میری خواہشوں کے اوزان کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''جی......'' ایک لمحہ کے لئے میں بوکھلا کر رہ گیا۔ کیا چاہیے مجھے؟ پھر لاشعوری طور پر میرے منہ سے نکل گیا۔

''لپ اسٹک'' سیلز مین نے بڑا سا ایک پیکٹ لا کر میرے سامنے رکھ دیا۔

''یہ...... یہ کیا ہیں؟'' حیرت سے میری آنکھیں پھیل گئیں۔

''گھبرائیں نہیں، لپ اسٹکس ہی ہیں'' اس نے مختلف شکل و شباہت کے خول ہٹا کر رنگ برنگے شیڈس کے لپ اسٹکس میرے سامنے پھیلا دیئے۔

''کیا آپ کے پاس ایسے لپ اسٹکس نہیں ہیں جو باہر سے بھی لپ اسٹک ہی معلوم پڑیں؟'' میرے اس سوال پر اس نے مجھے حیرت سے دیکھا، جیسے میں کسی برسوں پرانی قبر سے نکل کر وارد ہوا ہوں۔

اس کی نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے میں اسٹور سے باہر نکل آیا۔ اس کے بعد شہر کی درجنوں دکانیں چھان ماریں، مگر مطلوبہ شے نظر نہیں آئی۔ میں اس تلاش و جستجو میں کافی آگے نکل آیا، یہاں تک کہ شہر کی اونچی عمارتیں پیچھے رہ گئیں اور کھنڈر نما مکانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

چند قدم کے فاصلے پر میرا گھر تھا جسے میرے پردادا نے بنوایا تھا اور جس کی اینٹیں اتنی ہی بوسیدہ ہو چکی تھیں جتنی کہ قبر میں میرے آباو اجداد کی ہڈیاں، پھر بھی مجھے اپنے گھر سے والہانہ عشق ہے کہ یہ ان کی آخری نشانی ہے۔

اچانک ایک ٹوٹی پھوٹی اجاڑ سی دکان پر میری نگاہیں ٹھہر سی گئیں۔ ایک معمر شخص بڑی تندہی سے مختلف اقسام کے چھوٹے بڑے مرتبان ایک صاف اور سفید کپڑے سے اس احتیاط سے جھاڑ پونچھ رہا تھا کہ ذرا سی لاپروائی ہوتی تو شیشے کے یہ نازک مرتبان ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ ان مرتبان کے اندر رکھی چیزیں اپنا رنگ و روغن کھو چکی تھیں۔ ایک موہوم سی امید لیے ہوئے میں اس دکان میں داخل ہو گیا۔

''جناب! آپ کے پاس لپ اسٹک ہوگی؟'' میں نے بڑی عاجزی سے دریافت کیا۔ معمر شخص کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آ کر غائب ہو گئی۔ اس نے کچھ کہے بغیر لکڑی کے ایک سالخوردہ بکس سے کوئی چیز نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔

''بس یہی ایک بچی ہے''۔ میں نے اسے اٹھا لیا اور اس پر جمی ہوئی گرد کو صاف کر کے غور سے دیکھا تو خوشی سے اچھل پڑا۔ ارے، یہی تو میں تب سے تلاش کر رہا تھا۔ بالکل یہی......

لپ اسٹک کو مٹھی میں دبائے تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا گھر پہنچا تو دیکھا کہ روپا دروازے پر کھڑی ہوئی میرا انتظار کر رہی ہے۔

''کہاں رہ گئے تھے اتنی رات گئے؟ میرا دل تو شام ہی سے......'' میری تاخیر سے روپا واقعی پریشان نظر آ رہی تھی۔ میں نے اپنی بند مٹھی اس کے آگے بڑھا دی:

''بولو تو، کیا ہے اس میں؟''

''میں کوئی لال بجھکڑ ہوں جو......''

اس کا جملہ پورا ہونے سے قبل ہی میں نے اپنی مٹھی کھول دی۔

''ارے، یہ تو لپ اسٹک ہے۔ مگر نہایت ہی فرسودہ...... یہ دیکھئے، نئے برانڈ کی لپ اسٹک۔'' روپا نے میز کی دراز سے ایک پیکٹ نکال کر میری ہتھیلی پر رکھ دیا۔ میں نے پیکٹ کی تہوں کو کھولنا شروع کیا تو جیسے بجلی کے ننگے تار سے انگلیاں چھو گئیں۔

''تتلی؟''

''ہاں، مگر باہر سے ہی نا......اوپر کا خول اتار دیں تو......اور استعمال کے بعد اس کا دوسرا مصرف گھر کی بہترین سجاوٹ۔'' روپا نے اوپر کے خول کو دیوار پر چپکاتے ہوئے کہا۔

''مگر آپ تو ایسے گھبرا گئے جیسے یہ تتلی نہیں، چھپکلی ہو۔''

میں نے شرمندہ سا ہو کر اسے دیکھا۔ دیوار پر چپکا ہوا لپ اسٹک کا خول سچ مچ کی تتلی نظر آ رہا تھا اور اس کے خوبصورت پروں میں دیوار کا ایک اجڑا ہوا بدنما حصہ بھی چھپ گیا تھا۔ ❁❁

خصوصی توجہ طلب

اکادمی مجلّہ ماہنامہ ''زبان وادب'' کے بارے میں ساری معلومات کے لئے انچارج جناب محمد شاہد سے ان کے موبائیل 9897958115 پر نیز مسودات اور کتابوں پر انعامات کے سلسلے میں انچارج جناب محمد تمنا سے ان کے موبائیل 9931606459 پر رابطہ کریں۔ شکریہ! (ادارہ)

رئیس صدیقی

Bunglow No.-2, Rahat Kada, 14 Green Valley Enclave, Airport Road
Bhopal - 462030 (Mob. 9810141528)

شاہین

شاہین اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔اسے بچپن سے ہی جانوروں سے بے حد لگاؤ تھا۔وہ اپنے والد کے ساتھ اکثر شکار پر جایا کرتی تھی۔اس کے والد عاصم پڑھے لکھے تاجر تھے۔عاصم کو اردو ادب سے بھی لگاؤ تھا۔وہ شاعر مشرق اقبالؔ کے مداح تھے۔انہیں اقبالؔ کے بیشمار اشعار یاد تھے۔عاصم نے اپنی بیٹی کا نام اقبالؔ کے تصورِ شاہین پر رکھا تھا۔وہ اپنی بیٹی کو اپنے ساتھ مارننگ واک پر لے جاتے، اس کو جسمانی اور ذہنی طور پر مضبوط بنانے کے لیے مارشل آرٹ کی تربیت بھی دلواتے۔وہ ہر طرح سے اپنی اکلوتی اولاد کی شخصیت سازی میں لگے رہتے۔

سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا، پھر ایسا لگا کہ ان کی خوشحال زندگی کو کسی حاسد کی نظر لگ گئی۔جب وہ اٹھارہ سال کی ہوگئی تو اس کے والد ایک دن اچانک کار حادثہ میں اس فانی دُنیا سے کوچ کر گئے۔

اب گھر میں وہ تھی اور اس کی ماں۔سب کچھ اچانک ہوا تھا، اس لیے ان کے گزارے کا دوسرا کوئی معقول ذریعہ نہ تھا۔بس زندگی کے دن جوں توں کٹ رہے تھے۔سبھی رشتہ دار روپوش ہوگئے تھے۔کوئی بھول کر بھی نظر نہیں آتا۔

اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے شاہین نے پڑھائی کے ساتھ ساتھ کوئی کام کرنے کا ارادہ کیا۔ایک دن اس نے اخبار میں اپنے شہر میں ایک مشہور سرکس لگنے کا اشتہار دیکھا۔اس نے سرکس میں کوئی کام حاصل کرنے کا ارادہ کیا کیوں کہ شاہین کو جانوروں سے بہت لگاؤ تھا۔اس کی خواہش تھی کہ وہ وہاں ملازمت کرے اور سرکس کے جانوروں سے دوستی بھی ہوجائے۔

ایک دن شاہین سرکس کے مالک یا مینیجر سے ملنے پہنچی۔ وہاں وہ سرکس کے باہر لگی جانوروں کی تصویریں دیکھ رہی تھی کہ اندر سے اسے ہاتھیوں کے چنگاڑنے اور شیروں کے دہاڑنے کی آوازیں سنائی دیں۔وہ ہاتھیوں اور شیروں کی آوازیں سن کر بیتاب ہوگئی اور اس نے اسی وقت یہ فیصلہ کرلیا کہ آج وہ سرکس میں ملازمت حاصل کر کے ہی رہے گی۔

سب ہی چھوٹے بڑے ایک گیٹ سے سرکس کے پنڈال میں داخل ہو رہے تھے۔اسی قطار میں شاہین بھی لگ گئی۔ٹکٹ کے بغیر ہی اس نے ایک ریلے کے ساتھ اندر گھسنے کی کوشش کی، مگر اچانک ایک بھاری آواز نے اُسے روک دیا:

''اے لڑکی......تمہارا ٹکٹ......؟''

''میرے پاس ٹکٹ نہیں ہے۔'' شاہین نے بڑی ہی معصومیت اور سادگی سے جواب دیا۔

یہ جواب سنتے ہی ٹکٹ چیکر نے مضبوطی سے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا، لیکن شاہین نے ایسا زور کا جھٹکا مارا کہ اس آدمی کا ہاتھ خود بخود ڈھیلا پڑ گیا۔اس وقت اسے اپنی مارشل آرٹ کی تربیت کام آئی۔اِتنے میں ایک لحیم شحیم آدمی جو سب کچھ دُور سے کھڑا دیکھ رہا تھا، آ کر بولا:

''بے بی......میرا نام دارا ہے۔میں شیروں کا رنگ ماسٹر ہوں۔ کیا بات تھی جو اِس نے تمہارا ہاتھ پکڑ لیا تھا؟''

''سر، مجھے جنگلی جانور بہت اچھے لگتے ہیں اور میں......''

''لیکن تم نے ٹکٹ کے بغیر کیوں داخل ہونے کی کوشش کی؟''

''میں یہاں سرکس کے مالک یا مینیجر سے کام مانگنے آئی ہوں، لیکن کیا کروں جانوروں کی آوازیں سن کر میرا دل بے قابو ہوگیا۔ میرے شوق نے مجھے بیقرار کردیا۔میں معذرت چاہتی ہوں۔''

وہ معافی مانگ کر ٹکٹ خریدنے کے لیے پیچھے مڑی تھی کہ دارا نے اس کے شانے پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا اور بڑی نرمی سے بولا:

''بے بی رُکو۔ میں تمہارے شوق سے بہت خوش ہوا۔ مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ تمہیں بھی میری طرح جانوروں سے بہت لگاؤ ہے۔ بچپن میں مجھے بھی جانوروں سے بہت پیار تھا، بالکل تمہاری طرح اور آج بھی ہے۔ اچھا آؤ، میں اس سرکس کا مالک بھی ہوں۔ آؤ میں تمہیں اپنے دوستوں سے ملوادوں۔'' یہ کہتے ہوئے دارا شیروں کے پنجرے کی طرف چل دیا۔ دارا شاہین کو شیروں کے پنجرے کے پاس لے گیا اور ہر شیر سے بڑے پیار سے مخاطب ہوا۔ شیروں نے بھی اپنے اپنے انداز میں جواب دیا۔

شاہین شیروں کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی کہ دارا نے اس کے شوق و ذوق کو دیکھتے ہوئے کہا:

''تم ان شیروں کی رنگ ماسٹر بن سکتی ہو، اگر تم چاہو تو......''

''میں......؟'' اُس پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

''ہاں ہاں......تم۔'' دارا نے اُسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

''اِن شیروں کے لئے جتنی محبت، ہمت اور اعتماد کی ضرورت ہوتی ہے، وہ تم میں موجود ہے...... بولو سیکھوگی یہ کام......؟''

یہ سن کر شاہین پھولی نہ سمائی اور بولی:

''سر، آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی۔ میں بالکل تیار ہوں، بالکل تیار......''

دارا اس کے دلیرانہ عزم سے بہت خوش ہوا اور اُس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے بولا:

اچھا آج تم سرکس دیکھو، کل گیارہ بجے اپنے کسی سرپرست کو لے کر میرے پاس آ جانا۔''

دُوسرے دن شاہین اپنی ماں کو لے کر دارا کے پاس آئی۔ دارا نے اس کی ماں سے ایک فارم پر دستخط کرائے اور شاہین کو شیروں کے پنجڑوں کے پاس لے گیا اور پوچھا:

''روزانہ کی طرح آج بھی ریہرسل ہوگئی۔ کیا تم تیار ہو؟''

''جی ہاں، میں بالکل تیار ہوں۔''

دارا اس کو ڈریسنگ روم لے گیا اور اپنی اسسٹنٹ سے بولا:

''شاہین کو سرکس کی ڈریس پہنا کر جلدی سے باہر لے آؤ۔''

شاہین نے جلدی سے ڈریس پہنی اور باہر آ گئی۔ دارا نے اسے ایک ہنٹر تھماتے ہوئے چند ضروری رہنما باتیں بتائیں:

''شاہین، شیروں کے درمیان جانے سے پہلے چند باتیں یاد کرلو۔ ہر شیر تم سے نظر ملائے گا۔ اگر وہ ذرا سا بھی بھانپ گیا کہ تم ڈر رہی ہو یا تم باتیں اس سے کر رہی ہو، لیکن دیکھ کسی اور کی طرف رہی ہو تو وہ تم پر ٹوٹ پڑنے میں قطعی دیر نہیں کرے گا۔ دُوسری بات یہ ہے کہ تم کو اس بات کا بھی اندازہ لگا لینا ہوگا کہ وہ تم سے خوش ہے یا نہیں۔''

دارا نے یہ ہدایات دینے کے بعد لوہے کی چھڑوں سے بنے ہوئے پنجڑے کا دروازہ کھلوایا اور شاہین کے ساتھ اُس کے اندر داخل ہوا۔ دروازہ کھلتے ہی چاروں شیر اور شیرنی اپنی اپنی لال چوکیوں پر چھلانگ لگا لگا کر جا بیٹھے۔ دارا سب سے پہلے راجہ سے مخاطب ہوا۔ اس نے غرا کر ظاہر کیا کہ وہ خوش ہے۔ دارا نے شاہین کو سمجھاتے ہوئے کہا:

''شاہین،...... اس کے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھو، لیکن دھیان رکھنا کہ یہ پنجہ تو نہیں اُٹھا رہا ہے۔ اگر ایسا محسوس کرو تو فوراً اپنے ہنٹر کی موٹھ اس کی ناک پر جما دینا کیوں کہ شیر کی ناک بہت نازک ہوتی ہے اور اس عمل سے وہ جلد قابو میں آ جاتا ہے۔''

اِس کے بعد ہیرا اور پنّا سے شاہین کو ملوایا گیا۔ ان سب نے اُس کی دوستی قبول کر لی، لیکن چوتھی شیرنی نے جس کی طرف شاہین نے ذرا کم توجہ دی تھی، اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی اور دھول اُڑاتی ہوئی شاہین کی طرف جھپٹی، مگر دارا نے گرج کر کہا:

''رانی رُک جا......''

اِس آواز کو سن کر رانی وہیں رُک گئی۔ اس کا پنجہ جو اُس نے اُٹھایا تھا، مارے غصے کے کانپ رہا تھا۔ دارا نے آہستہ سے شاہین سے کہا:

''رانی گھبرا گئی، خطرہ ٹل گیا۔''

دارا نے یہ کہتے ہوئے شاہین کے چہرے کا جائزہ لیا، لیکن اس کے چہرے پر خوف کے ذرہ برابر بھی آثار نہ تھے۔ اس نے رانی سے اپنا دفاع کرنے کے لیے اپنے داہنے ہاتھ میں ہنٹر سنبھال لیا تھا۔ دارا اس کی ہمت اور بہادری دیکھ کو بولا:

(بقیہ ص ۴۴ پر)

راجہ یوسف

Anchidora, Anantnag - 192101 (Jammu and Kashmir)

خوشبو

آج میرا اپنا ہی فیصلہ میری بے چینی کا سبب بن چکا تھا۔ میری سوچ کے سوتے منجمد ہورہے تھے۔ سامنے ایک نہ ہٹنے والی دھندسی چھائی ہوئی تھی، جو میرے ذہن و دل کو بے انتہا اندھیرے میں ڈبورہی تھی۔ ساتھ ہی میرے روم روم سے درد کی ٹیسیں ابھر رہی تھیں اور میرے دل سے ایک کسک، ایک ہوک سی اٹھ رہی تھی۔

میں خود کو ہمیشہ غیر جانب دار منصف سمجھتا رہا ہوں۔ میرا ہر فیصلہ حق گوئی کا جیتا جاگتا نمونہ مانا جاتا تھا، پر آج میرا اپنا ہی غیر جانب دارانہ فیصلہ میرے اندر تلاطم بپا کررہا تھا۔ میں اپنے کمرے میں قید ہوکر رہ گیا تھا۔ میری بیوی رضیہ اور میرے دونوں بیٹے آصف اور عارف مجھ سے ناراض تھے۔

میں نے اپنا فیصلہ افشاں کے حق میں سنایا تھا۔ افشاں! جو ابھی تھوڑی دیر تک ہماری بہو، میرے بیٹے عارف کی بیوی تھی، اپنا سارا سامان سمیٹ کر اپنے میکے جا چکی تھی، لیکن پورا گھر اس کے سوگ میں بہت زیادہ اداس اور غم زدہ تھا۔ میرے غیر جانب دارانہ فیصلے نے سب کے چہروں سے خوشیاں چھین لی تھیں۔

دو سال قبل افشاں ہمارے گھر بہو بن کر آئی تھی۔ یہ شادی کرانا ہماری مجبوری بن گئی تھی۔ افشاں اور عارف اسکول کے دنوں سے ہی ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ افشاں بڑے باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ایم ایڈ کے بعد اس کی سرکاری نوکری بھی لگ گئی تھی۔ وہ افیشنٹ ٹیچر تھی، لیکن پھر بھی میرے بیکار بیٹے عارف سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ عارف ابھی ابھی پوسٹ گریجویشن سے فارغ ہوکر آیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ ریاست سے باہر جاکر کسی اچھی یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لئے داخلہ لے لے، لیکن افشاں کے پیار میں وہ کچھ ایسا گرفتار ہو چکا تھا کہ سب کچھ تیاگ دیا۔ اپنی ماں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ رضیہ بھی اس رشتے سے خوش تھی، شاید اس لئے کہ افشاں سرکاری ملازمہ تھی اور امیر باپ کی اکلوتی بیٹی بھی۔ اس شادی سے ہمارا بیٹا مفت میں کروڑوں کی جائیداد کا مالک بن رہا تھا، پر میں حیران تھا کہ افشاں کے والدین بھی اس رشتہ کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔

مجھے اس شادی پر اعتراض تھا۔ اعتراض یہی تھا کہ عارف میرا چھوٹا بیٹا تھا۔ میرا بڑا بیٹا آصف بھی ابھی یونیورسٹی میں ہی زیر تعلیم تھا اور چھوٹے بیٹے کی شادی، جو ابھی بیکار بیٹھا تھا اور آگے کی تعلیم کے بارے میں سیریس بھی نہیں تھا، پر میں رضیہ کی ضد کے سامنے مجبور ہوگیا اور یہ شادی ہوگئی۔

شادی کے بعد وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ عارف نے پڑھائی کے بجائے کہیں کنٹریکچول نوکری شروع کی تھی۔ اس کی آگے کی تعلیم کا میرا سپنا چکنا چور ہورہا تھا۔ ویسے اس شادی سے ہمارے گھر کے لئے بہت کچھ اچھا بھی ہوا تھا۔ خاص طور سے میرے اور رضیہ کے لئے تو بہت بہتر ہوگیا تھا۔ افشاں نے پورا گھر سنبھال لیا تھا۔ میری چھوٹی سی چھوٹی بات کا خیال رکھتی تھی۔ جوتے کی پالش سے لے کر میرے لئے ڈریس تک تیار رکھتی تھی۔ رضیہ کو کس وقت کونسی دوائی کھانی ہے، کون سی نئی دوائی لانی ہے، ڈاکٹر سے کب وقت لینا ہے، یہ سب افشاں ہی دیکھتی تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ افشاں میرے بڑے بیٹے آصف کی اچھی دوست بن گئی تھی۔ اس دوران آصف کو ایک نیوز چینل میں نیوز ایڈیٹر کی جاب لگ گئی تو گھر میں زیادہ ہی خوشیاں آ گئی تھیں۔

دو سال کیسے بیت گئے یہ پتہ بھی نہیں چلا، لیکن رضیہ بہت پریشان رہنے لگی تھی۔ اس نے دبے لفظوں میں ایک دو بار مجھ سے کہا بھی، پر میں نے دھیان نہیں دیا۔ اسے غم تھا عارف باپ نہیں بن رہا ہے اور میں سوچ رہا تھا کہ بچے تو ماں باپ کی مرضی سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔

کیا پتہ عارف اور افشاں ابھی بچے نہ چاہتے ہوں، پر اب کبھی کبھی مجھے بھی گھر میں ایک چھوٹے ننھے منے کی کمی محسوس ہورہی تھی، پھر ایک دن وہ سب کچھ ہوگیا جس سے ہمارے گھر کی ساری خوشیاں تنکوں کی طرح بکھر گئیں، جب آصف نے مجھے بتایا:

''ڈیڈی اگر میں بتادوں تو آپ کو یقین نہیں آئے گا......''

''پہیلیاں نہ بجھاؤ۔ صاف صاف کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟''

میں اسے تیکھی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''عارف ڈرگس لے رہا ہے اور وہ اب اس لت میں بری طرح سے مبتلا ہو چکا ہے۔''

آصف نے بتا تو دیا، پر میں کچھ سمجھا نہیں۔ اصل میں میرے لئے یہ سب کچھ ہضم کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ میرا بیٹا، عارف اور ڈرگس ...... میں یقین کرنے کے لئے تیار ہی نہیں ہورہا تھا۔ یہ ایک طوفان تھا جس میں میری عزت، رضیہ کے سارے خواب اور عارف کا مستقبل بہے جارہا تھا اور میں بے یارومددگار خود کو لٹتے دیکھ رہا تھا۔

اب ہمارے گھر میں کسی مستقبل کی باتیں نہیں ہورہی تھیں، ہم ایک دوسرے کے ساتھ خوشیاں نہیں بانٹ رہے تھے۔ بس ہر چہرے سے اداسی، غم، یاس اور ناامیدی ٹپک رہی تھی۔ میری باتوں میں چڑچڑاپن آرہا تھا۔ روز کسی نہ کسی بات پر رضیہ سے میرا جھگڑا ہورہا تھا۔ وہ ہر وقت عارف کا سپورٹ کرتی تھی تو میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی۔

افشاں یہ سب کچھ شادی سے پہلے ہی جانتی تھی اور عارف اس سے وعدہ کرچکا تھا کہ وہ شادی کے بعد یہ سب کچھ چھوڑ دے گا، لیکن یہ سب عارف کا جھوٹ تھا، فریب تھا۔ اب تو عارف حد پار کررہا تھا۔ پہلے پہل وہ افشاں سے پیسے مانگ کرلیتا تھا، لیکن جب اس نے پیسہ دینا بند کردیا تو وہ زور زبردستی کرنے لگا۔ اب بات مار پیٹ تک پہنچ چکی تھی۔

افشاں نے یہ بات رضیہ کو بتادی مگر اس نے افشاں کی ایک بات نہ سنی۔ وہ بیٹے کے خلاف ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتی تھی، پھر بات آصف تک پہنچ گئی اور آصف سے مجھ تک......تو ہم نے فیصلہ کیا کہ عارف کی یہ لت ہم سب کو لے ڈوبے گی، اس لئے اس کو کسی ایسے ہسپتال میں بھرتی کروادیں گے، جہاں سے بات باہر تک نہیں پھیلے۔

میری نظر میں پولیس کا ریہبل ٹیشن سنٹر زیادہ بہتر تھا۔ وہاں کا ایس۔ایس۔پی میری جان پہچان کا تھا اور وہ یہ بات کسی سے کہتا بھی نہیں، لیکن جونہی رضیہ نے پولیس ہسپتال کا نام سنا تو وہ چیختی چلاتی رہی۔ اس پر دورے پڑنے لگے۔ ہمیں عارف کے بدلے اسے کئی بار اسپتال میں داخل کرانا پڑا۔ عارف کی عادتیں بڑھ رہی تھیں تو دونوں میاں بیوی کے بیچ تناؤ بھی بہت زیادہ بڑھ رہا تھا۔ جھگڑا، مار پیٹ اور گالی گلوچ اب ان کا روز کا معمول بن چکا تھا۔ اس دن تو حد ہی ہوگئی جب عارف نے افشاں کے لاکر سے پانچ لاکھ کا ہار چرایا۔ تب پتا چلا عارف اس سے پہلے بھی افشاں کی کئی چیزیں بیچ کر کھا چکا تھا۔

گھر میں کافی ہنگامہ ہوا تھا۔ افشاں بھی بہت ضدی اور جلد باز تھی۔ اس نے عارف کے ساتھ شادی کرنے میں بھی اپنی ضد اور جلد بازی سے کام لیا تھا اور اب وہ عارف سے علیحدہ ہونے میں بھی اپنی ضد اور جلد بازی کا مظاہرہ کررہی تھی۔ وہ پھر ضد پر اتر آئی تھی۔ کسی بھی حال میں عارف کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھی۔ اس نے عارف پر کئی الزام لگادیئے، جس میں ایک یہ بھی تھا کہ عارف میں بیوی رکھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ ثبوت سامنے تھا۔ دوسال بعد بھی ان کا کوئی بچہ نہیں ہوا تھا۔

افشاں کے ساتھ اس کا باپ اور دوسرے رشتہ دار بھی کھڑے ہوگئے تھے۔ رضیہ اب بھی اپنے بیٹے کا سپورٹ کررہی تھی۔ آخر بات میرے فیصلہ دینے تک آگئی تھی۔ میں نے پورے کیس پر از سرنو غور کیا تو مجھے ہر زاویہ سے افشاں بے قصور اور عارف مجرم نظر آرہا تھا، چونکہ مجھے عارف میں بدلاؤ کی کوئی سبیل یا ڈرگس چھوڑ دینے کا کوئی بھی مثبت پہلو نظر نہیں آرہا تھا اور ایک جوان لڑکی کی زندگی تباہ ہورہی تھی جو میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

میں ایک منصف ہوں اور ہمیشہ سچائی کا ساتھ دیتا رہا ہوں۔ یہاں بھی میں نے وہی کیا۔ اپنے انصاف سے کام لیا۔ اپنے بیٹے کا کوئی لحاظ نہیں کیا۔ عارف کو ملزم جان کر افشاں کو آزاد کرالیا، اس کو طلاق دلادی۔ افشاں اور اس کے سارے رشتہ دار حیرت زدہ تھے۔ میں نے اس کیس میں اپنے بیٹے، اپنے خون کے خلاف بہت زیادہ بولا تھا اور اپنے بیٹے کے خلاف فیصلہ سناتے وقت نہ میری زبان لڑکھڑائی تھی، نہ ہی

فیصلہ لکھتے ہوئے میرے ہاتھ کپکپائے تھے۔

پھر کچھ ایسا ہوا کہ عارف ایک دم بدل گیا۔ اسے چپ سی لگ گئی۔ رضیہ بہت دنوں تک روتی رہی۔ گھر میں کوئی بھی مجھ سے ٹھیک طرح سے بات نہیں کر رہا تھا۔

عارف نے اپنا فیصلہ سنایا اور وہ مزید پڑھائی کے لئے ملک سے باہر چلا گیا۔ اب میں اسے روکنا چاہتا تھا، پر رضیہ نے اس پر کوئی بھی ردعمل نہیں دکھایا۔ عارف نے وہاں پر منیجمنٹ کی ڈگری لی اور وہیں کسی کمپنی میں جاب شروع کی۔ آصف بھی اپنے کام میں مشغول ہوگیا تھا۔ اب تو سب کچھ معمول پر آ گیا تھا۔ بس اتنی سی بات ہوگئی تھی کہ اس کے بعد ہمارے گھر میں کسی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں کھل پائی تھی۔

آج کئی دنوں سے میں ایک بڑی کشمکش میں آ پھنسا تھا۔ اپنے چیمبر میں کافی دیر سے اس کیس پر غور کر رہا تھا، جو افشاں کا کیس تھا۔ اس کے خلاف اس کے دوسرے یا تیسرے شوہر نے کیس دائر کیا تھا کہ افشاں ایک پاگل عورت ہے اور اس کو اس سے چھٹکارا دلایا جائے۔ دوبارافشاں میرے کورٹ میں بھی آئی تھی۔

جب پہلی بار میں نے اسے دیکھا تو میں دنگ رہ گیا۔ اس کے چہرے پر کوئی چاشنی، کوئی رونق نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں ویران لگ رہی تھیں۔ وہ ہونقوں کی طرح کورٹ میں ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ ایک دوبار اس کی نظریں میری نگاہوں کے ساتھ بھی ٹکرائیں، لیکن اس کے چہرے پر کوئی بھی تاثر نہیں ابھرا تھا، جیسے اس نے مجھے پہچانا نہیں تھا۔ میں اس کیس میں بہت زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔ میں یہ جاننے کے لئے بے قرار تھا کہ ہمارے گھر سے جانے کے بعد اس پر ایسی کیا بیتی ہے جو وہ کورٹ کچہری تک پہنچ گئی تھی۔ جب اس کی زندگی کے حالات سے میں باخبر ہوگیا تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

اس کے باپ نے پھر اس کی تین بار شادی کردی تھیں۔ دو جگہوں سے طلاق ہوچکی تھی اور یہ تیسرا عدالت سے خلع مانگ رہا تھا۔ افشاں اپنے باپ کی اکلوتی بیٹی تھی اور اس کے پاس زمین جائیداد کی کوئی کمی نہیں تھی۔ خود بھی سرکاری ملازم تھی اس لئے کوئی بھی اس کے ساتھ شادی کرنے کے لئے تیار ہوجاتا تھا، لیکن اب تک اس کے دو شوہر اسے طلاق دے کر بھاگ چکے تھے۔ اب یہ تیسرا آدمی تھا جس سے افشاں کے باپ نے ایگریمنٹ لیا تھا کہ اگر وہ افشاں کو چھوڑ دے گا تو اس کو ایک خطیر رقم ادا کرنی ہوگی۔ وہ آدمی دولت کی لالچ میں آ کر شادی تو کر بیٹھا، لیکن کچھ دنوں کے بعد ہی افشاں کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔ جب افشاں کے باپ نے یہ شرط یاد دلادی کہ یا تو افشاں کے ساتھ رہو یا وہ رقم ادا کرو جو شادی سے پہلے ایگریمنٹ میں لکھی ہے تو اس نے انصاف کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

آج کیس کی پھر پیشی تھی اور میں اپنے چیمبر میں بیٹھا اس ادھیڑ بن میں تھا کہ آخر افشاں کا شوہر اس سے خلع لینے کے لئے کیا جواز پیش کرے گا۔ آخر کورٹ لگ گیا۔ وکلا جرح کر رہے تھے اور میں بار بار افشاں کی طرف دیکھ رہا تھا جو بے نیاز کبھی عدالت کی چھت اور کبھی آس پاس بیٹھے اور کھڑے لوگوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔

وکیل اس کے شوہر سے سوال جواب کر رہے تھے۔ میں نے ان کو روکا اور خود ہی افشاں کے شوہر سے سوال کیا:

''تم اس سے خلع کیوں چاہتے ہو۔''

''جج صاحب وہ اس لئے کہ میں اسے طلاق نہیں دے سکتا ہوں، کیونکہ اس کے باپ نے جو مجھ پر بوجھ ڈال کے رکھا ہے، اُسے میں کبھی اتار ہی نہیں سکتا ہوں۔''

''پر تم اسے علیحدگی کیوں چاہتے ہو؟''

''جناب...... یہ ایک پاگل عورت ہے۔ میرے لالچ نے اسے میرے سر منڈھ دیا ہے۔''

''کیا پاگل پن کیا ہے اس نے ...... یہ تو بالکل بھی پاگل نہیں لگ رہی ہے۔''

''جج صاحب! میں ہی کیا، اس سے پہلے جو اس کے تین شوہر تھے وہ اسے چھوڑ کر بھاگ کیوں گئے ہیں، اسی سے پوچھئے نا......''

''کیا کرتی ہے یہ؟'' میں نے پہلے افشاں کو دیکھا پھر اس کے شوہر سے سوال کیا:

''جناب! سنا ہے جب یہ پڑھتی تھی، انہی دنوں اس نے کسی سے محبت کی ہے، پھر دونوں کی شادی بھی ہوگئی۔ وہ شادی کیوں

ٹوٹ گئی مجھے نہیں معلوم۔ اب جس کے ساتھ بھی اس کی شادی ہو جاتی ہے۔ یہ بڑے شوق سے شادی کا جوڑا پہن تو لیتی ہے اور حجلہ عروسی تک بھی آجاتی ہے۔ جب اس کے قریب جاؤ تو یہ آدمی کو سونگھتی ہے، پھر چیختی ہے، چلاتی ہے:

’’تم میرا پہلا پیار نہیں ہو۔ تم میں میرے پہلے پیار کی خوشبو نہیں ہے، پھر شادی کا جوڑا پھاڑ کر بھاگ جاتی ہے۔ تنہائی میں روتی رہتی ہے اور لوگوں کے سامنے ہنستی رہتی ہے۔‘‘

میں ہکا بکا افشاں کو دیکھ رہا تھا اور وہ لمحہ یاد کر رہا تھا جب میں نے اس کے حق میں طلاق کا فیصلہ سنایا تھا اور یہ مجھے حیرت سے دیکھتی رہی تھی۔ اب مجھے اپنے غیر جانب دارانہ منصف ہونے پر پچھتاوا ہو رہا تھا اور افشاں سے زیادہ اپنی ضد اور جلد بازی پر افسوس۔ ❁❁

شاہین (ص ۴۰ سے آگے)

’’اگر خدا نے چاہا تو تم اگلے ہی مہینے اِن سب کی رِنگ ماسٹر بن جاؤ گی اور ان کے درمیان آکر تماشا دکھانے لگو گی۔‘‘

دارا کی یہ بات صد فی صد صحیح ثابت ہوئی۔ اگلے ہی مہینے سے وہ شیروں کے درمیان آکر تماشا دکھانے لگی اور سب سے حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ حملہ آور رانی اب اس کی گہری دوست بن گئی تھی۔ ایک بار راجہ اُس پر جھپٹا تو رانی نے اپنی نئی دوست شاہین کی حفاظت کرتے ہوئے جواباً اچھل کر اُس کے منھ پر ایک زوردار طمانچہ رسید کر دیا۔

مہینے کی پہلی تاریخ کو سو سو کے نوٹوں کی ایک گڈی شاہین کو دیتے ہوئے دارا بولا:

’’تمہیں روزانہ زندگی کا خطرہ مول لینا پڑتا ہے۔ اِس کے عوض میں یہ پیسے بہت کم ہیں، لیکن جلد ہی تمہاری تنخواہ بڑھا دی جائے گی۔ تمہارے کام سے سب ہی لوگ بہت خوش ہیں۔‘‘

شاہین اس دن بہت خوش تھی۔ وہ اپنی ماں کے لیے ان کی پسند کی مٹھائی اور ایک شال لے کر گھر پہنچی اور ماں سے لپٹ کر اپنی پہلی تنخواہ ان کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ یہ دیکھ کر ماں کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا آئیں اور وہ بولیں:

’’بیٹی! تم نے یہ جو خطرناک کام شروع کیا ہے، اس سے میں رات دن خوف میں جیتی ہوں اور ہر وقت دعا کرتی ہوں کہ تم ہمیشہ صحیح سلامت رہو اور زندگی میں تم کو کبھی کوئی دُکھ نہ آئے۔‘‘ شاہین نے بات کاٹتے ہوئے ماں کو تسلی دی:

’’ماں...... تم گھبراؤ نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے روزانہ کچھ گھنٹے موت کے سائے میں گزارنے پڑتے ہیں، لیکن یہ موت کے سائے، انسانی منافقت اور گمراہ کن روپہلے سائے کے مقابلے، زیادہ خطرناک نہیں ہیں۔ یہ جنگلی اور خونخوار جانور، انسان کی بہ نسبت، کہیں زیادہ قابل بھروسہ اور وفادار ہوتے ہیں۔ یہ للکارتے ہیں، چھپ کر کسی پر وار نہیں کرتے۔ یہ غرا کر ڈراتے ضرور ہیں، لیکن اپنے فائدے کے لئے کسی کی زندگی سے نہیں کھیلتے!!! ❁❁

مشرقی تہذیب کا سچا عاشق...... (ص ۱۶ سے آگے)

جدید کی کشمکش کی واضح تصویریں ملتی ہیں اور اِس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اکبر کی شاعری میں اُس زمانے کی روح پوری طرح کھچ آئی ہے اور اُس کے نقش و نگار اِتنے روشن ہیں کہ اکبر کی شاعری کی تاریخی اہمیت نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔‘‘

سچ بات تو یہ ہے کہ اکبر الٰہ آبادی نے اُس عہد کی آنکھوں دیکھی جھلکیاں طنز و مزاح کے انداز میں اپنی شاعری کے ذریعہ پیش کر کے نہایت حسن و خوبی اور خلوص کے ساتھ مشرقی تہذیب کے ایک سچے عاشق کا رول ادا کیا ہے۔ یاس یگانہ چنگیزی نے شاید یہی وجہ ہے کہ اکبر الٰہ آبادی کی شاعری کو غالب کی شاعری سے برتر قرار دیا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ اکبر کی نظر قوم کی میراث بھی تھی اور قوم کی تقدیر بھی۔ آخر میں اپنی بات اکبر کے اِس شعر پر ختم کرتا ہوں ؎

شعر اکبر میں کوئی کشف و کرامات نہیں
دل پہ گزری نہ ہو ایسی کوئی بات نہیں

❁❁❁

منظومات

فخؔر مہدانوی داناپوری*

خداوندا......

خداوندا خداوندا عطا فرما ، عطا فرما تو اپنے عفو کا وعدہ وفا فرما وفا فرما
خداوندا مرا دل خنجر عصیاں کا زخمی ہے کرم کے خاص مرہم سے دوا فرما دوا فرما
خداوندا گنہ کا بوجھ سر پر میرے بھاری ہے گراں باری کو رحمت سے جدا فرما جدا فرما
خداوندا رہائی غیر ممکن ہوگئی میری میری آشفتہ حالی پر دَیا فرما دَیا فرما
خداوندا مجھے امید رحمت کھینچ لائی ہے غریب و زار و بیکس ہوں بھلا فرما بھلا فرما
خداوندا اگرچہ میں نے لاکھوں ہی خطائیں کیں مگر تو حق بخشش کو اَدا فرما اَدا فرما
خداوندا محمد کی صفت میرا وظیفہ ہو لبوں کو میرے تو حکم ثنا فرما ثنا فرما
خداوندا تو اپنی ذات بے مانند کے صدقے مری خواہش ، مری حاجت روا فرما روا فرما

گنہ کوئی نہیں اے فخؔر چھوٹا تجھ سے دنیا میں
برائے مغفرت ناداں دعا فرما دعا فرما

* فخؔر مہدانوی کا پورا نام حکیم محمد شریف حسین ہے۔ اُن کے والد منشی عبداللطیف اپنے وقت کے نامی گرامی آدمی تھے۔ فخؔر کی پیدائش ضلع پٹنہ کے مہدانواں نامی گاؤں میں ۱۹رمضان المبارک ۱۲۷۵ھ/ ۵۹-۱۸۵۸ء کو ہوئی اور مہدانوں ہی میں ۱۳۴۰ھ/ ۲۲-۱۹۲۱ء میں انہوں نے انتقال فرمایا۔ فخؔر کی نانیہال کمہرار، پٹنہ میں تھی اوران کے نانا مولوی ولایت حسین عظیم آبادی کمہرار کے مشہور معززین میں تھے۔ فخؔر کا ضخیم دیوان ان کی وفات سے پانچ چھ سال پہلے ۱۳۳۴ھ/۱۶-۱۹۱۵ء میں مرتب ہو چکا تھا جو سلیمان پریس، پٹنہ سے بنام ''کلیات فخؔر'' طبع ہوا۔ فخؔر داناپوری، مولانا محمد ابراہیم آروی کے مشہور ''مدرسہ احمدیہ'' سے فراغت کی سند رکھتے تھے، ساتھ ہی ساتھ نذیر احمد محدث دہلوی سے انہیں سند حدیث اور حکیم حسن لکھنوی سے سند طبابت حاصل تھی اور شاعری میں وہ حکیم عبدالاحد شمشاؔد لکھنوی سے شرف تلمذ رکھتے تھے۔ شاعری میں قیسؔ آروی، تمنؔا عمادی اور شفیؔق عمادپوری اس لحاظ سے ان کے استاد بھائی قرار پاتے ہیں۔ فخؔر مہدانوی کو فن تاریخ گوئی میں بھی بڑی مہارت تھی۔ ان کی کلیات میں تقدیسی کلام اور غزلیات کے علاوہ رباعیاں، قطعات اور سہرے بھی ہیں۔ فخؔر نے ۱۹۰۴ء میں پتھر کی مسجد میں اپنا ذاتی مکان بھی بنالیا تھا، جہاں اکثر و بیشتر مشاعرے کا اہتمام ہوا کرتا تھا۔ (مزید تفصیل کے لئے: ''بیسویں صدی کے چند شعرائے داناپور، ڈاکٹر محمد صدر عالم صدیقی، مطبوعہ کراؤن بک پبلشرس، پٹنہ)

ظفؔر رانی پوری

At. Ghayas Nagar, Ranipur, P.o. Barharia, Dist. Siwan- 841232 (Mob. 9461825490)

غزلیں

اپنی آنکھوں نے پہن رکھا ہے خوابوں کا لباس
جب سے تونے رُخ پہ ڈالا ہے نقابوں کا لباس

تن پہ کانٹوں کے بھی ہوتا ہے گلابوں کا لباس
تم نے دیکھا ہی نہیں خانہ خرابوں کا لباس

اس سفر کی راہ منزل سے مری منسوب ہے
اس سفر میں لے کے چلنا انقلابوں کا لباس

تم سے بھی ممکن ہے کہ نکلیں گی کرنیں پھوٹ کر
آسماں بن جاؤ ، پہنو ، آفتابوں کا لباس

دن تو اپنا سب گزر جاتا ہے ہنگاموں کے بیچ
زیب تن کرتی ہے ، لیکن شب عذابوں کا لباس

❁❁❁

ایک انجانی سی اُلجھن اک دوانہ پن سا ہے
یہ مرا احساس میری جان کا دشمن سا ہے

زندہ رہنے کی ابھی زندہ ہیں مجھ میں خواہشیں
گہرے پانی میں کوئی شعلہ ابھی روشن سا ہے

اب وفا ، مہر و محبت ، پیار ، اخلاق و خلوص
پتھروں کے جسم پہ پھولوں کے پیراہن سا ہے

طے تو ہو سکتا ہے آسانی سے ہر اک مرحلہ
آدمی اپنے ارادے میں اگر آہن سا ہے

اپنے چہرے پر تمازت کی رمق تو آگئی
اس کی آنکھوں کا مگر موسم ابھی ساون سا ہے

❁❁❁

دل

یاسؔ یگانؔہ چنگیزی کی رباعیوں کے مجموعہ ''ترانہ'' سے ماخوذ

دل ہو زندہ تو بار خاطر کیوں ہو
درد و غم ناگوار خاطر کیوں ہو
باقی ہو دماغ میں اگر بوئے اُمید
پیراہن جان غبار خاطر کیوں ہو

❁❁❁

دل جو مردہ ہو تو زندگانی بھی حرام
پیری کا ذکر کیا ، جوانی بھی حرام
افسانۂ عمر جاودانی بھی حرام
آب حیواں کہاں کا ، پانی بھی حرام

❁❁❁

دل کیا ہے اک آگ ہے دہکنے کے لئے
دنیا کی ہوا کھا کے بھڑکنے کے لئے
یا غنچۂ سربستہ چٹکنے کے لئے
یا خار ہے پہلو میں کھٹکنے کے لئے

❁❁❁

جب عالم ایجاد نے صورت پکڑی
مجموعۂ اضداد نے صورت پکڑی
آباد ہوئی دل میں انوکھی دنیا
کیا درد خدا داد نے صورت پکڑی

فردوسؔ گیاوی

Arif Nagar, Gewal Bigha, Gaya - 823001 (Mob. 9546037777)

غزلیں

پورے نہ ہوئے اپنوں سے ارمان یہاں پر
اچھے برے کی ہوگئی پہچان یہاں پر
جاؤں تو کدھر جاؤں یہی سوچ رہا ہوں
ہر سمت مسائل کے ہیں طوفان یہاں پر
اس شہر میں ترے تو پرستار بہت ہیں
کم کم ہیں مگر فن کے قدردان یہاں پر
اب کون رکھے گا یہاں ایمان سلامت
بک جاتے ہیں چند سکوں میں انسان یہاں پر
ہو جاؤ کھڑے تم بھی فریادی کی صف میں
سنتے ہیں آج آئیں گے سلطان یہاں پر
آلودہ نہ ہو جائے کہیں شیفتہ الفت
فردوسؔ تو بھی رکھنا ذرا دھیان یہاں پر

❁❁❁

مقام زیست یہی ہے وفا کی راہ کو چوم
جو چومنا ہے تو تو بھی دل تباہ کو چوم
کسی کو چومنا کارِ ہنر میں شامل ہے
سکوں ملے گا تجھے اُس کی بارگاہ کو چوم
نگاہ اُس کی اُٹھے اور کام ہو جائے
جو معتبر ہیں نگاہیں تو اُس نگاہ کو چوم
اگر پناہ ملے تجھ کو اُس کے گیسو میں
بڑے خلوص سے اُس گیسوئے پناہ کو چوم
نباہ کی کوئی صورت نکل ہی آئے گی
بس ایک بار محبت سے اُس نگاہ کو چوم
اب اس کے نقش کف پا سے درگزر فردوسؔ
نظر سے خاک اُٹھا ، لب سے اُس کلام کو چوم

❁❁❁

ابیات مشاہیر

وہ ناز میں ، ادا میں ، اعجاز میں ، سراپا
خوبی میں گل رُخاں سوں ممتاز ہے سراپا (ولی دکنی)

عالم عالم عشق وجنوں ہے ، دنیا دنیا وحشت ہے
دریا دریا روتا ہوں اور صحرا صحرا وحشت ہے (میرؔ)

اُس نازنیں کی باتیں کیا پیاری پیاریاں ہیں
پلکیں ہیں جس کی چھریاں ، آنکھیں کٹاریاں ہیں (مصحفیؔ)

گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو (چکبستؔ)

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی (اقبالؔ)

شکر الطاف نہیں ، شکوۂ بیداد نہیں
کہیں کچھ ہمیں تیری تمنا کے سوا یاد نہیں (حسرتؔ)

مختار عالمؔ اعظمی

Mangal Bazaar, Phulpur, Dist. Azamgarh - 276304 (Mob. 9838612585)

غزلیں

مجھ کو تنہائی کی وحشت سے نکالے کوئی
میں سمندر ہوں مجھے آ کے کھنگالے کوئی

ٹوٹ کر بکھرا ہوں ہر سمت سے ریزہ ریزہ
مجھ کو چن چن کے کرے میرے حوالے کوئی

ہو نہ بنیاد تو ڈھنا ہے اُسے طوفاں میں
لاکھ دیوار عمارت کی بنالے کوئی

منزلیں کیسے قدم بوسی کیا کرتی ہیں
دیکھ لے آکے مرے پاؤں کے چھالے کوئی

میں بھی شہرت کی بلندی پہ پہنچ جاؤں گا
میری پگڑی سر بازار اُچھالے کوئی

ختم ہوگی یہ اندھیروں کی اجارہ داری
لے کے آئے تو محبت کے اُجالے کوئی

درگزر کرنا ضروری ہے خطائیں عالمؔ
جب نظر اپنی ندامت سے جھکالے کوئی

❀❀❀

سکون و امن کا خرمن جلا دیا کس نے
ذرا سی بات کو شعلہ بنا دیا کس نے

مجھے پتہ ہے شراروں نے گھر جلائے ہیں
سوال یہ ہے انہیں حوصلہ دیا کس نے

ستم کسی پہ ہو ہم لوگ چیخ پڑتے تھے
ہمارے منھ پہ یہ تالا لگا دیا کس نے

یہ کر سکو تو ہمیں روند کر گزر جاؤ
وگر نہ کس کو یہاں راستہ دیا کس نے

تھا آس پاس مرے دوستوں کا ہی جمگھٹ
تو پھر یہ پیٹھ میں خنجر چبھا دیا کس نے

کوئی بتائے کہ کس کس کا ہاتھ تھا اس میں
مرا یہ شہر محبت جلا دیا کس نے

مرا مزاج تو خلوت پسند ہے عالمؔ
تمہاری یاد کو میرا پتہ دیا کس نے

❀❀❀

تعلیقات فراقؔ

مرے اشعار پر سر دُھنتی جائیں گی نئی نسلیں
میں نے اس آواز کو مر مر کے پالا ہے فراقؔ
فراقؔ شعر وہ پڑھنا اثر میں ڈوبے ہوئے
تارے ہیں آب دیدہ ، دلِ آسماں اُداس

بچا کر وقت رکھے گا یہ دستاویز انسانی
آج جس کی نرم لو ہے شمع محرابِ حیات
کہ یاد میرؔ کے انداز کی دِلا دینا
پہنچی ہے دور تک مرے شعر و سخن کی بات

ڈاکٹر اوینا ش امنؔ

Shiv Chandra Path, 2- Kali Mandir Road,Hanuman Nagar, Patna - 800020
(Mob. 7870678786)

غزلیں

گھسی پٹی سی روایت میں ڈھل نہیں سکتا
تمہارے ساتھ میں اب اور چل نہیں سکتا

ضروری یہ ہے کہ ہر سمت انقلاب آئے
اکیلے تم سے زمانہ بدل نہیں سکتا

جہاں کے عیش و طرب کی زمین چکنی ہے
گرا جو ایک دفعہ پھر سنبھل نہیں سکتا

تمہارے ظلم کو سہتے گزر گئیں صدیاں
غبار دل سے پلوں میں نکل نہیں سکتا

مری تو زیست کا مقصد ہے فقط تبدیلی
کھلونے پا کے میں ہرگز بہل نہیں سکتا

مجھے ہے فخر وراثت پہ اپنی پرکھوں کی
متاعِ غیر کی خاطر مچل نہیں سکتا

کوئی تو امنؔ اب اس کو حصار میں لے لے
چراغ آندھیوں میں ایسے جل نہیں سکتا

❁❁❁

جہاں میں لگتا نہیں مرا دل کہ موت ڈھونڈے کوئی بہانہ
تری محبت بھی خودکشی ہے، تری عداوت بھی جاں سے جانا

زمیں کا بستر ، فلک کا سایہ ، ندی کا پانی ، بدن پہ خرقہ
یہ وہ مزہ ہے جہاں میں جس کو کسی نے سمجھا کسی نے جانا

کہاں پہ آ کے ملوگے مجھ سے پتہ بتاؤں تو کیا بتاؤں
وہی گلی ہے ، وہی نگر ہے ، وہی ہمارا غریب خانہ

نہیں ہوئی ان سے بات میری اگرچہ ہوتی تو میں یہ کہتا
مری محبت نہیں ہے کپڑا بدل دیا جب ہوا پرانا

کہیں پہ نوحہ، کہیں پہ نغمہ، کہیں پہ خوشیاں، کہیں پہ صدمہ
یہ ساری دنیا فقط تماشا ، حیات کا کب کوئی ٹھکانہ

کچھ اور دن کا ہی میہماں ہوں، طویل میرا سفر نہیں ہے
نہیں رہوں گا زمیں پہ میں جب تو خاک چھانے گا یہ زمانہ

مری طرف اس طرح نہ دیکھو ، نہ امنؔ پوچھو سوال کوئی
ہزاروں باتیں ہیں دل میں میرے مگر ہے مشکل زباں پہ لانا

❁❁❁

اشعارِ سوداؔ

فکر معاش ، عشق بتاں ، یادِ رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا
موسیٰ نہیں کہ سیر کروں کوہِ طور کا

سوداؔ نگاہِ دیدۂ تحقیق کے حضور
جلوہ ہر ایک ذرّے میں ہے آفتاب کا

سوداؔ تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہے تجھ کو میرؔ سے اُستاد کی طرف

سعیدؔ قادری

Sahebganj, Muzaffarpur (Mob. 9199533834)

غزلیں

تنگ آ گیا ہوں دوستو دنیا کی ریت سے
اس مطلبی جہان کی میں بات چیت سے

مجھ سے بچھڑ کے غیر سے وہ جا کے مل گیا
جس نے گلاب مجھ کو دیئے تھے پریت سے

موسم بہار کا ہے ہوائیں ہیں دل ربا
ملتے ہیں آج چل کے کسی اپنے میت سے

اس کا اَتیت کیا ہے ، کیا سوچتے ہو آپ
مجھ کو غرض کہاں ہے کسی کے اَتیت سے

پی پی کے ، جھوم جھوم کے رقص و سرور میں
ملتا کہاں قرار ہے اس گیت ویت سے

طاقت تمہارے پاس ہے تو کیا ہوا جناب
بنتی کہاں ہے بات یہاں ہار جیت سے

کچھ تو کرو خیال سعیدؔ حزین کا
جاتی ہے جان اس کی یہاں ایسی سیت سے

❀❀❀

دل تو پاک صاف ہے عین شین قاف ہے
سب کو اعتراف ہے عین شین قاف ہے

ہر گھڑی طواف ہے عین شین قاف ہے
اب نہ انحراف ہے عین شین قاف ہے

رات مختصر رہی ، روح بے سکوں رہی
اس سے اختلاف ہے عین شین قاف ہے

سوکھ کر زباں مری مثل خار ہوگئی
چشم پر غلاف ہے عین شین قاف ہے

جاں کنی کا وقت ہے ، دل میں اک آس ہے
اب کہاں لحاف ہے عین شین قاف ہے

جنگ ہو جدال ہو یا کوئی مقام ہو
ہر خطا معاف ہے عین شین قاف ہے

مان لو سعیدؔ کی پاس کی بعید کی
گھر میں اعتکاف ہے عین شین قاف ہے

❀❀❀

اشعارِ جوشؔ

ازل کے دن سے درِ حسن کا بھکاری ہوں
اِدھر بھی ایک نظر ، میں ترا پجاری ہوں

عجیب حسن ٹپکتا ہے چشم و ابرو سے
مہک رہا ہے بدن کم سنی کی خوشبو سے

ہوشیار اے بے حیا ، غدار ، اے نفس دنی
دیکھ آ پہنچا وہ اے بدبخت وقت جاں کنی

بھیڑیوں کے طور سے انساں کا کرتا ہے شکار
خاک ہو جا اے جہاں بانی کے جھوٹے اقتدار

غزلیں

مرزا رضوانؔ بیگ
Jama Masjid Chowk, Akot,
Dist. Akola, Maharastra - 444101
(Mob. 9850291851)

درد کو اپنے مرے غم سے ملانے کے لئے
اُس نے آواز لگائی ہے بلانے کے لئے

اپنے مہندی سے رچے ہاتھ دکھانے کے لئے
اس نے تصویر کو بھیجا ہے رُلانے کے لئے

کچھ رفاقت کے دیے دل سے بجھانے کے لئے
سردیاں لوٹ کے آئی ہیں ستانے کے لئے

سانس کی طرح میرے جسم میں آئی نکلی
پھر تیری یاد مجھے چھوڑ کے جانے کے لئے

یوں ترا بزم سے وہ روٹھ کے جانا ، جاناں
ہم نے دل تھام لیا خود کو بچانے کے لئے

فاصلے شہروں کے دونوں ہی کی قسمت ٹھہرے
کوئی بھی راہ نہیں ساتھ نبھانے کے لئے

❁❁❁

زویا شاہینؔ
Begum Sultan Jahan Hall, Room No. B-204
AMU, Aligarh - 202002

در حقیقت یہ جہاں اس شخص کی جاگیر ہے
جس کے دست ناز میں اخلاق کی شمشیر ہے

پڑھنے والی آنکھ پڑھ ہی لے گی ساری داستاں
میرے قاتل تیرے ماتھے پر لہو تحریر ہے

یوں تو چشم شوق نے منظر سمیٹے ہیں کئی
دل میں ، لیکن سب سے بہتر آپ کی تصویر ہے

پیش باطل کٹ تو سکتے ہیں مگر جھکتے نہیں
زندگی کے سامنے یہ اُسوۂ شبیر ہے

دوستو! تخریب کے جمنے نہ پائیں گے قدم
اب نئی پیڑھی کے دل میں جذبہ تعمیر ہے

آپ دنیائے مسرت میں بھی رہ کر ہیں اُداس
میں ہوں کتنی شادماں کہ غم میری جاگیر ہے

صاحبو! شاہینؔ کی پروازِ سخن کو کیا ہوا
شوخیٔ غالبؔ ہے شعروں میں نہ سوزِ میرؔ ہے

❁❁❁

غزلیں

ڈاکٹر مقصود عالم رفعتؔ

At. Jarhatia Momin Tola, P.o. Maqsooda, Via, Pandaul,
Dist Madhubani - 847234 (Bihar) (Mob. 9315145062)

حق الفت ادا کرے کوئی
بے وفا سے وفا کرے کوئی

عشق میں دل کسی کا ٹوٹے نہیں
ایسا اک معجزہ کرے کوئی

جتنے رہبر تھے راہزن نکلے
اب کسے رہنما کرے کوئی

وہ کہ بن جائے جو عذابِ جاں
ایسی دولت کا کیا کرے کوئی

کوئی تو آئے پرسش غم کو
آہ میری سنا کرے کوئی

سرکشی تیز ہے ہواؤں کی
ایک روشن دیا کرے کوئی

سہل ہے لقمہ اجل بننا
موت کا سامنا کرے کوئی

جب معزز ہوں بے وفا ، پھر کیوں
اپنا وعدہ وفا کرے کوئی

دہر میں ملتی یوں نہیں رفعتؔ
خود کو خود سے جدا کرے کوئی

❀❀❀

سمیع احمد ثمرؔ

Shreerampur, Mahammadpur, Manjhi - 841223
Saran (Mob. 7488820892)

اس نے آغازِ شعر خوانی کی
سن رہا ہوں غزل میں فانیؔ کی

بھول بیٹھا ہے جو خدا کو ہی
رب نے اس پر بھی مہربانی کی

جس نے ایمان اپنا بیچ دیا
میں نے اس سے بھی حق بیانی کی

جو محبت میں کھا چکے دھوکا
بات کرتے ہیں وہ بھی جانی کی

موت کا ڈر نہیں کسی کو بھی
فکر ہے سب کو زندگانی کی

یاد آتی ہے آئے دن ہم کو
یادِ ماضی کی اور جوانی کی

انتہا جو ہے میری الفت کی
وہ ثمرؔ ہے تری کہانی کی

❀❀❀

شازیہ نیازی

Alam Nagar, Burnpur, Asansol - 713325 (Mob. 8250564231)

غزلیں

کس کی تقلید میں اُگایا روپ
کیا تری دسترس میں آیا روپ

آخری بار وہ پلٹ آئے
ہم نے یہ سوچ کر سجایا روپ

اس نے دیکھا ہے یوں محبت سے
اب کہیں جا کے کام آیا روپ

چاند تاروں کی بھیڑ تھی لیکن
ہم نے دیکھا نہیں پرایا روپ

کچھ نے پلکیں سنواریں کاغذ پر
کچھ نے تھا ریت پر بنایا روپ

عقل والوں نے سیرتیں دیکھیں
آنکھ والوں نے آزمایا روپ

عمر کے آخری پڑاؤ پر
بن گیا ہے بس ایک سایہ روپ

❁❁❁

اس سے کہہ دو کہ کام لائے ہونٹ
یہ جبیں تو ہے بس برائے ہونٹ

لکھ رہی ہوں اسی تمنا میں
میرے اشعار گنگنائے ہونٹ

کوئی تعریف ہو کہ بوسہ ہو
ہم کو بھاتے نہیں پرائے ہونٹ

تیری آنکھیں رہیں نمی سے دور
تیرے چہرے پہ کھلکھلائے ہونٹ

میری اس بے زباں سماعت کو
کاش اک بار ہی بلائے ہونٹ

روز ہم مسئلے بڑھاتے ہیں
روز دیتا ہے ہم کو رائے ہونٹ

❁❁❁

اشعارِ مشاہیر

اے ابر تر تو اور کسی ملک کو برس
اس ملک کو ہماری ہے یہ چشم تر ہی بس (میرؔ)

جوانی کہاں اور کہاں پھر یہ دن
مثل ہے کہ ہے چاندنی چار دن (میر حسنؔ)

ہم اُس کے ساتھ ہیں کہ خدا جس کے ساتھ ہے
لیکن خبر نہیں کہ خدا کس کے ساتھ ہے (اکبرؔ)

روح مومن کو عطا بارِ خدا ادراک ہو
یہ نہیں تو صور پھنک جائے کہ قصہ پاک ہو (جوشؔ)

غزلیں

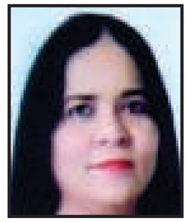

شمع کوثر شمعؔ

C/o Md. Naushad Ali, Nohsa Road, Syed Colony,
90 Degree Apartment, Block-D, Flat No. 106,
Phulwarisharif, Patna - 801505 (Mob.9835202493)

شعلے بھڑک اُٹھیں نہ کہیں انتظار کے
''اچھے نہیں ہیں ڈھنگ دلِ بے قرار کے''

جنت نشان کب رہی کشمیر کی زمیں
جلنے لگے ہیں آج بدن بھی چنار کے

غالبؔ ، جگرؔ ، فراقؔ تو ٹھہرے شہِ غزل
کچھ کم نہیں کلام بھی دلِ داغ دار کے

اُستاد کی غزل پہ تو اِترا رہے ہو تم
کب تک لئے پھرو گے اُجالے اُدھار کے

شمعؔ غزل پہ وار تو کرتے ہو جانِ من
دیکھو تم آئینے میں بھی خنجر اُتار کے

❀❀❀

محمد فاروق گیاوی

Moh. Market, P.o. Sarwan Bazar, P.s. Barachatti
Dist. Gaya - 824201 (Mob. 9905021495)

امن و اماں کے واسطے بھی کوئی کام ہو
اَب میرے شہر میں نہ کوئی بے لگام ہو

دیواروں پر سبھی کے لکھا یہ پیام ہو
ہر حال میں شریفوں کا بھی احترام ہو

میری زبان ہو کہ تمہاری زبان ہو
ہر شخص کی زبان کا اپنا مقام ہو

تعلیم یافتہ سبھی ، حق میں سماج کے
گر متحد ہو جائیں تو پھر اچھا کام ہو

اب ظلم آسمان پر اپنے پہنچ گیا
ظالم کا شہر میں کوئی تو انتظام ہو

❀❀❀

اشعار

صدیق مجیبیؔ

زندگی میں درد و غم سے میں نے سودا کر لیا
ریشمی کپڑے بنے چوڑی سے خالی ہاتھ نے

خواب تو خواب ہیں یہ خود ہی بکھر جائیں گے
جب بنا سکتے ہو خود اپنا زمانہ آپ ہی

یہ دنیا ہے یہاں تو بے وفا زیادہ ہی ملتے ہیں
جب ترے ناز و ادا نے دل پہ قبضہ کر لیا

خود تو ننگے سر رہے اوروں کی زیبائش ہوئی
بکھرے سپنوں کو ہم تعبیر نہیں کہہ سکتے

پھر بھلا بے چین کیوں ہو تم زمانے کے لئے
بڑا ناداں ہے تو کیوں غیر کو اپنا بناتا ہے

نام کتاب	:	اردوادب: ترقی پسندی سے جدیدیت تک
مصنف	:	پروفیسر ڈاکٹر محمد توقیر عالم
ناشر	:	جنتا پبلشنگ ہاؤس، مظفر پور
صفحات	:	۳۳۱ قیمت : ۶۰۰ روپے
مبصر	:	ڈاکٹر ابرار احمد

پروفیسر محمد توقیر عالم اردو دنیا میں کسی تعریف وتعارف کے محتاج نہیں۔ان کا تعلق بہار یونی ورسٹی مظفر پور کے شعبۂ اردو سے رہا ہے اور وہ ایک میقات کے لیے مولانا مظہر الحق عربی فارسی یونیورسٹی پٹنہ کے پرو وائس چانسلر کے عہدے پر بھی فائز رہ چکے ہیں۔ وہ دانشور بھی ہیں اور ادیب بھی، صحافی بھی ہیں اور ناقد بھی، ایک اچھے اور مقبول مدرس بھی ہیں اور تحقیق کے بھی دل دادہ ہیں۔ انھوں نے بہت سے معرکۃ الآرا تحقیقی مضامین لکھے ہیں، جو ان کی مختلف تحقیقی تنقیدی کتابوں میں شامل ہیں، ان کے مضامین تواتر وتسلسل کے ساتھ جرائد اور رسالوں کی زینت بھی بنتے رہتے ہیں۔ان مضامین ومقالات کے تنوع اور ان کی جامعیت و ہمہ گیری نے سبھی اردو ناقدین ومحققین کو چونکایا ہے اور ادبی سطح پر دعوت غور وفکر بھی دی ہے۔

فی الوقت میرے سامنے ان کی کتاب ''اردو ادب: ترقی پسندی سے جدیدیت تک'' ہے، جس میں انھوں نے مختلف عناوین قائم کر کے ترقی پسندیت سے لے کر جدیدیت تک کے شعری اور نثری ادب کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ ان کا یہ جائزہ تحقیقی بھی ہے اور تنقیدی بھی۔انھوں نے ان دونوں پیمانوں پر اردو ادب کو جانچا اور پرکھا ہے اور جو نتائج برآمد ہوئے ہیں، ان کو سپرد قرطاس کیا ہے جس میں وہ صد فی صد کامیاب ہیں۔

اس کتاب میں انہوں نے ابواب بندی اور فصول سازی سے یکسر انحراف کرتے ہوئے صرف مقالات کے عناوین کی ایک فہرست ابتدا میں دی ہے، اس طرح دیگر کتابوں سے اس کتاب کا انداز پیش کش مختلف بھی ہے اور منفرد بھی، کتاب کی ابتدا میں نہ کوئی تقریظ ہے اور نہ کوئی مقدمہ، کتاب نفس مضمون سے شروع ہوتی ہے اور برآمد شدہ نتائج کے اندراج کے بعد اختتام کو پہنچ جاتی ہے۔اس کتاب میں کل پانچ طویل و بسیط مقالات کی شمولیت ہوئی ہے، جن کے عناوین یہ ہیں:

(۱) ترقی پسندی: پس منظر اور پیش منظر

(۲) ترقی پسندی: ادب وشعر کی کسوٹی پر

(۳) ترقی پسندی سے جدیدیت تک: ایک عبوری دور

(۴) جدیدیت: آغاز، عروج وزوال (۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۰ء تک)

(۵) ترقی پسندی کے بعد اور جدیدیت سے پہلے کا ادب

پہلے مقالے میں انہوں نے ترقی پسندی سے پہلے جنم لینے والی ان تمام تحریکات اور عوامل وعناصر کا جائزہ پیش کیا ہے، جو ترقی پسند تحریک کی پشت پر کارفرما رہی ہیں اور پھر اردو زبان میں ترقی پسندی کا ایک تحریک کی حیثیت سے جائزہ لیا ہے اور اس کے فوائد و ماحصل کا شمار کرایا ہے۔ ترقی پسندی کا چشمہ کیسے پھوٹا، اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

> ''ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے قیام سے پہلے فکر ونظر کے وہ سارے دھارے یک جا ہونے لگے تھے جن سے ترقی پسندی کا چشمہ پھوٹا اور جنھوں نے اس عالم گیر رجحان کی ترویج و پرورش میں مثبت حصہ لیا۔ وہ شاعر و ادیب جو لندن گئے اور جنھوں نے یورپ کے حالات و مناظر سے براہ راست واقفیت حاصل کی، ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے بانی ہوئے۔ یہی شاعر وادیب سفر یورپ سے پہلے مشہور زمانہ باغیانہ تصنیف 'انگارے' کے ذریعہ ۱۹۳۲ء میں ترقی پسندی کے رجحان کو دستاویزی

شکل دے چکے تھے۔'' (اردوادب: ترقی پسندی سے جدیدیت تک، پروفیسر محمد توقیر عالم، ص۲۴)

ایک جگہ اور اس بات کو ذرا دوسرے الفاظ میں انہوں نے یوں لکھا ہے کہ ترقی پسندی اردو میں رونما ہونے والی تحریکات کا نقطۂ آغاز نہیں ہے، بلکہ اس سے پہلے بھی شعر وادب میں حیات اجتماعی کی صورتیں پیدا ہوتی رہی ہیں، پروفیسر موصوف لکھتے ہیں:

''میرا مدعا یہ نہیں ہے کہ ترقی پسندی نے ساری مثبت قدروں کو اپنایا اور صرف شعوری اور غیر شعوری کا فرق رونما ہوگیا، کہنے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ ترقی پسند تحریک سے پہلے بھی شعر وادب میں حیات اجتماعی (کی) صورتیں ابھرتی تھیں خاص طور پر اردو شاعری ان تمام تاریخی عوامل سے براہ راست متاثر ہوئی جنھوں نے انسانی زندگی میں کرب کا زہر گھولا تھا، یہ اور بات ہے کہ اس اثر پذیری میں انفرادی طرز فکر کارفرما تھی اور شاعر ہیئت اجتماعی کا نمائندہ ہو کر بھی فرد واحد کی حیثیت سے گویا ہوتا تھا۔'' (اردوادب: ترقی پسندی سے جدیدیت تک، ص ۶۷)

ترقی پسندی نے صرف اردو زبان وادب کے ادیب و شاعر کو ہی اپنی جانب متوجہ نہیں کیا، بلکہ اس تحریک نے ہندستان کی دوسری زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا۔ نہ صرف ہندستان بلکہ عالم گیر پیمانے پر اس تحریک کے اثرات محسوس کیے گئے۔ پروفیسر توقیر عالم اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''ترقی پسندی ایک ایسی ادبی اصطلاح ہے جو صرف اردو میں رونما نہیں ہوئی، بلکہ بیک وقت ہندستان کی کئی زبانوں میں اپنے اثرات کا رنگ جما چکی ہے اور صرف ہندستانی زبانوں تک ہی اس کا دائرۂ اثر محدود نہیں ہے۔ اس کی لپیٹ میں دنیا کی چھوٹی اور بڑی بہت سی زبانیں اس طرح آئیں کہ عالمی افکار و نظریات اور فنون و ادبیات میں مشترکہ طور پر سیاسی اور اقتصادی اسباب و علل نے یکساں نتائج پیدا کیے۔ اس طرح ترقی پسندی کی لہر جو یورپ سے شروع ہوئی اور ایشیا کے دوسرے ملکوں تک پہنچی، ہندستان کے طول وعرض میں بھی پھیل گئی۔ ہندستان میں ترقی پسند ادیبوں کی کل ہند کانفرنس جب بھی منعقد ہوئی اس میں صرف اردو والے شریک نہیں ہوئے، بلکہ ہندستان کی دیگر زبانوں کے شعرا وادبا نے بھی پر جوش حصہ لیا اور اس طرح بنگالی، پنجابی، تامل، تلگو، ملیالم اور کنڑی زبانوں کے ادیبوں سے بھی (رابطہ) پیدا ہوا اور اردو والے جو اپنے ہی ملک کی مختلف زبانوں کے ادب کی فکری وفنی رفتار سے بے خبر تھے، اب راہ ورسم اور ارتباط کی منزلوں سے آشنا ہوئے اور اس طرح ترقی پسندی ہندستان کی مختلف زبانوں کے ادیبوں اور دانشوروں کو متحد و منظّم کرنے اور ایک کو دوسرے سے جوڑنے اور قریب لانے کا وسیلہ بن گئی۔''

(اردوادب: ترقی پسندی سے جدیدیت تک، ص ۲۷)

اس کتاب کا دوسرا مقالہ ہے ''ترقی پسندی: ادب وشعر کی کسوٹی پر'' اس مقالے میں پروفیسر موصوف نے شعر وادب کی کسوٹی پر ترقی پسندی کو تولنے کی کوشش کی ہے اور اس میں انھوں نے اپنے مطالعہ کا جو ماحصل پیش کیا ہے، وہ بہت سی طویل کتابوں میں تلاش کرنے سے بھی نہیں ملے گا۔ منٹو کو ترقی پسندوں نے بھی اپنے خیمے میں شامل کرنے کی کوشش کی ہے اور جدیدیوں نے بھی انھیں اپنے گروہ کے ہراول دستے میں شامل کرنے کی سعی کی ہے۔ دراصل سعادت حسن منٹو کی شخصیت کثیر الجہات اور کثیر الابعاد ہے، ان کے افسانوں کا تنوع، موضوعاتی رچاؤ اور انداز پیش کش سبھی کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ سعادت حسن منٹو پر پروفیسر توقیر عالم نے بھی مختصرا لکھا ہے اور خوب لکھا ہے، چند سطروں میں ان کی ادبی شخصیت کے تمام نکات و جہات کو سمیٹ لینے کی کوشش کی

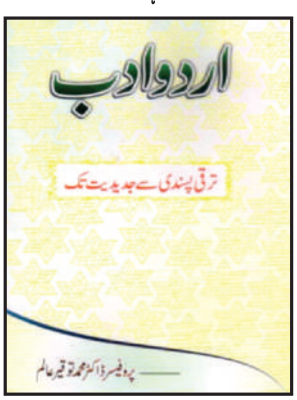

ہے، وہ لکھتے ہیں:

''سعادت حسن منٹو بڑے ذہین نکتہ رس اور جدت پسند لکھنے والوں میں ہیں، وہ ترقی پسندی سے بھی وابستہ ہوئے اور پھر الگ ہوگئے، لیکن یہ علیحدگی محض ضد اور رد عمل کے طور پر ہے، شروع میں وہ روس کے ادیبوں اور انقلابیوں سے متاثر ہوئے، یہ اثر رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز رسالہ 'عالمگیر' کے 'روسی ادب نمبر' میں مترجم کی حیثیت سے شمولیت کے ساتھ ہوا، منٹو شروع میں چیخوف، گورکی وغیرہ کے افسانوں کا ترجمہ کرتے رہے، لیکن اس ترجمہ نگاری نے انھیں متاثر بھی کیا اور طبع زاد تحریروں میں بھی وہ اشتراکی نظر آتے ہیں۔ آگے چل کر اشتراکیت سے وہ اس وقت الگ ہوئے جب ترقی پسندوں نے جنس عریانی کو اشتراکیت کے دائرے سے خارج کر دیا اور سخت گیری سے کام لیتے ہوئے یہ فیصلہ سنادیا کہ یہ موضوع رجعت پسندی کی علامت ہے، اس طرح خود ترقی پسندوں نے انھیں اپنی برادری سے خارج کر دیا، نتیجے کے طور پر منٹو نے ایک باغی کی طرح یا ایسے ذہین اور شریر لڑکے کی طرح اس کام کی طرف زیادہ رغبت دکھائی جس سے اسے روکا گیا۔''

(اردوادب: ترقی پسندی سے جدیدیت تک، ص۸۰)

منٹو کی شخصیت اور اس کے فن کو نمایاں کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

''منٹو کے افسانوں میں ترقی پسندی سے زیادہ انسانی نفسیات کی آئینہ داری ہے۔ نفسیاتی پیچ وخم جو مختلف معاملات ومسائل سے تعلق رکھتے ہیں، منٹو کے افسانوں میں نمایاں ہیں۔ نفسیات سے اسی دلچسپی نے منٹو کو عریاں نگاری کے قریب کر دیا اور اس عریاں نگاری کی بنا پر ترقی پسندوں نے منٹو کو اپنی صف سے باہر کا آدمی سمجھا، اگرچہ جنسی آزادروی ترقی پسندی کا جزو ہے اور فحش نگاری کے خلاف حیدرآباد کی ترقی پسند کانفرنس منعقدہ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں کوئی ٹھوس تجویز منظور نہ ہوسکی، اس کے باوجود ترقی پسندی کی اقتصادی اور سیاسی جہتوں نے یہ احساس دلایا کہ جنسی آزادی کی گھناؤنی شکل ترقی پسندی کی منزل نہیں۔'' (اردوادب: ترقی پسندی سے جدیدیت تک، ص۸۰وص۸۱)

اسی طرح مجنوں گورکھ پوری کی ترقی پسندیت اور اس کے حدود و ثغور کا احاطہ کرتے ہوئے جن الفاظ میں ان کی ترقی پسندیت میں اعتدال اور توازن کا ذکر کیا گیا ہے، وہ بھی قاری کو متاثر کرتا ہے۔ پروفیسر موصوف لکھتے ہیں:

''ترقی پسندی سے متاثر ہونے کے باوجود مجنوں گورکھپوری کے یہاں توازن، اعتدال، سلجھا اور سنبھلا ہوا انداز فکر ملتا ہے، وہ ادب میں زندگی کے تسلسل اور ارتقا کی جھلک پاتے ہیں اور سماجی تبدیلیوں کو ادبی تبدیلیوں پر اثر انداز ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ روح عصر کے قائل ہیں، لیکن ادب میں ماورائے عصر کو دیکھنے کے (بھی) آرزومند ہیں، کیوں کہ یہی وہ عنصر ہے جو ادب کو پائیداری اور دائمی قدر بخشتا ہے۔ وہ ترقی پسندی کے میکانکی انداز تنقید کو ناپسند کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اختر حسین رائے پوری جیسے انتہا پسندوں کے نقطۂ نظر کی تردید کی ہے اور قدیم ادبی سرمایے کی اہمیت وعظمت کا اعتراف کیا ہے، وہ ادب کی کلی اہمیت پر زور دیتے ہیں اور فکر وفن دونوں کے رشتہ باہمی میں اعتدال کے قائل ہیں۔ انھوں نے روسی ادب اور مارکسیت کا گہرا مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ مارکسی ادیبوں کے یہاں یکسانیت اور یک رخاپن ہے۔ ادب میں اجتماعیت اور انفرادیت کے باب میں بھی ان کا نقطۂ نظر معقول ہے، وہ نہ تو دیگر ترقی پسندوں کی طرح انفرادیت کی یکسر نفی کرتے ہیں اور نہ غیر ترقی پسندوں کی طرح ادیب کی اجتماعی ذمہ داریوں سے انکار کرتے ہیں۔''

(اردوادب: ترقی پسندی سے جدیدیت تک، ص۱۵۶)

جدیدیت کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے، اس باب میں مختلف ناقدین نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، مگر پروفیسر توقیر عالم نے جس طرح اس کے نقطہ آغاز کا سراغ لگایا ہے، اس میں جدت اور انفرادیت ہے اور اس رائے میں توازن اور اعتدال بھی ہے، یہ رائے افراط وتفریط سے یکسر مبرا ہے۔ پروفیسر موصوف کے لفظوں میں:

''جدیدیت کی تردید کرنے والے کبھی حالی سے جدید دور کے آغاز کو جوڑتے ہیں اور کبھی ترقی پسند تحریک کو بھی جدید قرار دے کر یہیں سے قدیم وجدید کی بحث چھیڑ دیتے ہیں۔ اس وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ترقی پسندی ہی جدید دور کا نقطہ آغاز ہے، اس باب میں بہت سے غیر ترقی پسندوں نے بھی تعبیر کی غلطی سے حقیقتوں کو خواب وخیال کے دھندلکوں میں گم کر دیا ہے۔ یہ تسامح ان لوگوں کو ہوا ہے جو ترقی پسندی کے عہد میں اس سے قدیم تر دور کی علامت بن کر زندہ تھے، ان کے نزدیک ہر نئی تخلیق نئی اور ترقی پسند دونوں تھی۔'' (اردو ادب: ترقی پسندی سے جدیدیت تک، ص ۱۸۷)

جدیدیت میلان ہے یا تحریک، اس باب میں بھی اردو کے ناقدین مختلف الرائے رہے ہیں، کسی نے اس کو میلان قرار دیا ہے تو کسی نے اسے تحریک کے خانے میں رکھا ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر توقیر عالم نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے سنجیدگی اور توازن کی لے جھلکتی ہے:

''یہ بات بھی اہل نظر کے درمیان اختلاف کا سبب رہی کہ جدیدیت میلان ہے یا تحریک، ابتدا میں جدیدیت کی مخالفت نے اس حد تک قدم آگے بڑھا دیا تھا کہ جدیدیت کو منصوبہ بند سازش قرار دیا گیا کہ یہ ایک سوچی سمجھی تحریک ہے جو ادب کو مقصدیت کے راستے سے منحرف کرنے کی سازش کا نتیجہ ہے اور اس طرح ادب سے زندگی کی تزئین و آرائش کا منصب چھین لینے کی کوشش ہے۔ جب اس دعوے پر دلیل مہیا کرنے کی بات کہی گئی تو اسے تحریک قرار دینا واقعی محتاج دلیل رہ گیا، کیوں کہ تحریک کی جو بھی تعریف پیش جائے، اس کی روشنی میں جدیدیت تحریک قرار نہیں پاتی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جدیدیت نے اتنے ہم نوا پیدا کر لیے کہ ایک میلان ہوتے ہوئے بھی اس کی حمایت کرنے والے بڑی تعداد میں اٹھ کھڑے ہوئے جیسے یہ ایک تحریک ہو۔'' (اردو ادب: ترقی پسندی سے جدیدیت تک، ص ۱۹۰)

پروفیسر توقیر احمد کا اسلوب و انداز معتدل اور سلجھا ہوا ہے۔ وہ ثقیل تراکیب وتعبیرات سے احتراز واجتناب کرتے ہیں اور اپنی بات سادہ و سہل یعنی عام فہم زبان اور سلیس انداز میں پیش کرنے کے حامی رہے ہیں۔ ان کا بیانیہ سادگی اور شائستگی کا حامل ہوتا ہے۔ وہ عربی فارسی کے نامانوس الفاظ استعمال کر کے اپنی تحریر کو معمہ نہیں بناتے۔

وہ سبک ہندی کے استعمال پر یقین رکھتے ہیں اور اسی وجہ سے ناقدین کے درمیان ان کی جو شبیہ بنتی ہے وہ نئی اور منفرد ہوتی ہے۔ پروفیسر توقیر عالم کی ادبی تحریروں اور خصوصاً ان کی زیر نظر کتاب سے ان کی محنت ومشقت کا اندازہ ہوتا ہے۔

مجھے امید ہے کہ ان کی دیگر کتابوں کی طرح اس کتاب کو بھی علمی وادبی حلقوں میں پذیرائی ملے گی اور ان کے قلم سے ایسے شاہکار وجود میں آئیں گے جو اردو ادب میں گراں قدر اضافہ وادبی اثاثہ ثابت ہوں گے اور ہمارے ذہن ودماغ کو روشنی بخشیں گے۔

نام کتاب	:	شمع سخن
مصنف	:	حبیب غفران ملکؔ
ناشر	:	آدم پبلشرز اینڈ ڈسٹریبیوٹرس، دہلی
صفحات	:	۱۱۲ قیمت : ۱۰۰ روپے
مبصر	:	شرف الہدیٰ

شعری مجموعہ ''شمع سخن'' جناب حبیب غفران ملکؔ کی ایک عمدہ کتاب ہے۔ مصنف نے اس کتاب کا انتساب اپنی شریک حیات محترمہ شاہدہ غفران کے نام کیا ہے۔ کتاب کے مشمولات میں غزلوں اور نظموں کے علاوہ تہنیتی کلام، سہرے، رباعی اور قطعات بھی شامل ہیں

جن سے شاعر کے ادبی ذوق اور مختلف شعری اصناف سے عملاً شغف کا پتہ چلتا ہے۔ کچھ نظمیں ایسی ہیں جن سے طلبا کو حوصلہ اور تحریک ملتی ہے اور ان میں کچھ بہتر کر گزرنے کا عزم پیدا ہوتا ہے، جیسے نظم ''تحریک بیداری'' اور ''طالب علم کا عزم'' وغیرہ ۔

عزم و ہمت چاہئے میداں میں آنے کے لئے
نور و ظلمت کی لڑائی جیت جانے کے لئے
بہتا جھرنا جو کہیں پر تھم گیا ہے
ہر رکاوٹ کو ہٹادو پھر بہانے کے لئے
علم کی دولت لئے جواب بھی محو خواب ہیں
چل پڑو اے دوستو، ان کو جگانے کے لئے

(تحریک بیداری)

ظلمت کا اندھیرا ہے تو پرواہ نہیں
گھٹا گھنگھور گھری ہے تو پرواہ نہیں
راہ میں کانٹے ہیں تو پرواہ نہیں
باد مخالف ہے تو پرواہ نہیں
میرے خواب و تمنا مرے ساتھ تو ہے
قوتِ عزم و محنت مرے ساتھ تو ہے
علم کی شمع سے گھٹاؤں کو اُڑا دیں گے
عزم کے طوفاں سے گھٹاؤں کو اڑا دیں گے
راہ کے کانٹوں کو ٹھوکر سے ہٹا دیں گے
ہر رکاوٹ کو ہمت سے گرا دیں گے
میری طاقت، مری ہمت مرے ساتھ تو ہے
راہ دشوار، مگر حوصلہ میرے ساتھ تو ہے

(طالب علم کا عزم)

یہاں شاعر نے طالب علموں کو بادِ مخالف سے لڑنے کی ہمت دلا کر مستقبل کا سنہرا خواب دکھایا ہے۔ ان کے اندر قوتِ ارادی اور توانائی بھرنے کا کام کیا ہے اور انہیں اس طرح منزل کا واضح شعور بھی دیا ہے ۔

میری منزل ہے بس آگے بڑھنا
میری منزل ہے کچھ ہٹ کر کرنا
میری منزل ہے کچھ پا کر رہنا
میری منزل ہے بس آکاش کو چھونا
میرے سر پر مرے ہمدرد کا ہاتھ تو ہے
میرے استاد و بزرگوں کی دعا ساتھ تو ہے

حب الوطنی سے سرشار ہو کر بھی شاعر موصوف نے خوبصورت اور بامعنی نظم ''زندہ باد اے وطن'' لکھا ہے ۔

زندہ باد اے وطن ، زندہ باد اے وطن
ایسی دھرتی پہ ہے رقصاں رقصاں گگن
تیرے لہراتے بازو ہیں گنگ و جمن
زندہ باد اے وطن ، زندہ باد اے وطن

جناب ملکؔ زیرِ نظر کتاب کے شعری متن کو انگریزی شکل دے کر اُس کا Transliteration محض پیش کیا گیا ہے، جو شعری اصناف کا Translation نہیں ہے۔ اس سے کتاب کی تھوڑی سی ضخامت ضرور بڑھی ہے، مگر اس سے ایک منفرد انداز بھی جھلکتا ہے۔ یہاں شادی پر نظم اور سہرے بھی لکھے گئے ہیں۔ ایک دعائیہ نظم بھی تحریر کی گئی ہے جو شاعر غفران ملکؔ نے اپنی ایک رشتہ مند کے لئے لکھی ہے جن میں دعاؤں کی گونج کچھ اس طرح ہے ۔

منور ہوگئی محفل دولہا کے نور سے دیکھو
رخِ روشن کی ضیا لے کر نبیل آئے ہیں
اَنعم کی خوشیوں کی کوئی حد نہیں
ان کو دعا دینے کئی عرفان آئے ہیں
دعائے ابراہیمی جو ثریا تک جا پہنچے
سنہولی سے چچا وہ دعا لے کے آئے ہیں
دعاؤں کا گلدستہ محبت کی تھالی میں
بڑے ارمان سے پھوپھا غفران لائے ہیں

اور حسب حال نظم ''اچھے دن'' بھی اس کتاب میں ایک اچھوتی ہے جس میں شاعر نے کسانوں اور کاشتکاروں کے حالات کی منظر کشی کی ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ یہ نظم شاعر کے اُبلتے جذبات کا مظہر ہے۔

اس کتاب میں کہیں کہیں غلطیاں راہ پا گئی ہیں اور ص ۴، ص ۶، ص ۸، ص ۱۰، ص ۱۶ ااور ص ۱۸ پر انگریزی میں غزل (Ghazal) کی Spelling Gazal چھپ گیا ہے جو غلط ہے۔ اسی طرح شب فرقت کو SHAB-E-FURKAT لکھا گیا ہے جو میری نظر سے صحیح نہیں اسے SHAB-E-FURQAT ہونا چاہئے۔تاہم شائقین ادب اور قارئین کے لئے یہ مجموعہ لائق توجہ ضرور ہے۔

نام کتاب	:	افکار			
مصنف	:	نتن پربھاکر مھاجن			
طابع	:	قاسمی پرنٹرس، ممبئ			
صفحات	:	۴۴	قیمت	:	۷۰روپے
مبصرہ	:	**بینش فردوس**			

تبصرہ کی غرض سے ایک مختصر سی کتاب اس وقت میرے مطالعہ کی میز پر ہے۔ اس شعری مجموعہ کا نام ''افکار'' ہے اور اس کے شاعر کا نام نتن پربھاکر مھاجن ،جن کا اکیڈمک مضمون کامرس ہے اور جو بینک کی ملازمت میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔انہوں نے اپنے ''ذاتی تعارف'' میں اردو زبان کو اپنی ''طلب وجنوں'' اور شعری مجموعے کے مطالعہ اور فلم بینی کو اپنا ''شوق'' بتایا ہے اور دو صفحہ پر مشتمل ''اپنا تعارف'' لکھتے ہوئے اردو کی طرف آنے کی روئیداد بہت ہی صاف ستھرے انداز سے بیان کر دیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابتدائی دور میں محض سنگیت سے محظوظ ہونے والے نتن پربھاکر جی گیت اور شاعری کی طرف ساحؔر لدھیانوی کے نغموں سے متاثر ہو کر آئے اور اردو کی شیرینی نے انہیں اس زبان کا دیوانہ بنالیا، یہاں تک کہ ۲۰۱۰ء میں ان کے شوق کو تکمیل کی ایک راہ ملی، انجمن اسلام صابو صدیق کالج آف انجینئرنگ کے ''اردو میلہ'' میں صدر انجمن ڈاکٹر ظہیر قاضی نے ان کی خواہش پر ان کی بروقت رہنمائی کی اور اس طرح قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئ دہلی کے تحت ممبئ میں ہی چلنے والے ایک آموزش اردو مرکز میں پروفیسر فیروز احمد شیخ تک ان کی رسائی ہوئی اور انہوں نے وہاں اردو کلاس میں داخلہ لے کر اپنی مراد پائی۔ بالفاظ دیگر پربھاکر مہاجن غیر اردو داں طبقہ سے تھے، جو اپنے شوق بے پایاں کے صدقے اپنی منزل تک پہنچے اور اردو سیکھ کر اس مقام تک آئے جس کی گواہی ان کے ''افکار'' سے مل رہی ہے۔

نتن پربھاکر مھاجن کا زیر نظر مجموعہ ۱۸ نظموں پر مشتمل ہے۔ اس کا آغاز نظم ''انسانیت'' سے ہوتا ہے جو ایک عمدہ اور پر اثر فکری نظم ہے۔ اس میں شاعر نے دنیا کی بے ثباتی کا ذکر لایا ہے کہ اس دنیا سے اگر چہ ہر شخص خالی ہاتھ جاتا ہے، لیکن زندگی میں جسے اس حقیقت کا شعور آجاتا ہے، صحیح معنوں میں وہی انسان کہلانے کا حقدار ہوتا ہے اور وہی دوسروں کے دکھ درد سمجھتا ہے۔ شاعر نے یہ نکتہ اپنے داخلی ذاتی احساس کے حوالے سے نہایت خوبی کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ ؎

کسی کے درد سے جب در محسوس ہوتا ہے
مجھے انسان ہونے کا گمان ہوتا ہے
کیا ہے میرا جو لے جاؤں گا اس دنیا میں
رہ جائے گی ہر چیز میری بس اس دنیا میں
شعور یہ آجائے جب
وہ بیداری کا سماں ہوتا ہے

اس نظم میں، ارتقائی کیفیت، ذہنی تحریک اور استدلال و آفاقیت کے عناصر روشن ہیں اور یہاں شاعر کا چبھتا ہوا سوال واقعی ذہن کو جھنجھوڑ دیتا ہے اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

اس مجموعہ کی دوسری نظم ''معشوقہ'' یادوں پر مشتمل نہایت حسین رومانی نظم ہے، جس میں منظر کشی اور تقابل کا وصف نمایاں ہے۔ یہاں شاعر نے اخلاقی انتباہ کا فریضہ بخوبی تمام ادا کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ نظم محبوب کی تخیلاتی توصیف سے گزر کر ایک خاص ارتقائی صورت اختیار کر لیتی اور خدائے پاک کی صناعی کے برملا اعتراف تک پہنچتی ہے ؎

ہر گام پہ سنبھل کر دیکھنا
کسی کا دل نہ ہو پیروں تلے
تیرے قدموں کے خاک کی آرزو

فرشتوں کو بھی زمین پر لاتی ہے
وہ مصور نہ ملا اب تک
جس کے رنگوں میں تو ڈھل پاتی ہے
خدا کی صناعی نے دی ہو جسے شکل جمیل
کہیں اس کی بھی تصویر بنائی جاتی ہے

نظم ''ابر گریزاں'' پر اثر سوالیہ انداز اور حسین و بلیغ استعارے سے مزین ایک ایسی نظم ہے جس میں شاعر نے کرب دروں کے احساس کا نہایت موثر اور شاعرانہ اظہار کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس میں مناسبات کا التزام اور استعاراتی کیف و کم بھی لائق التفات ہے ۔

مطلع غزل زندگی سنانے والے میرے ہم نوا
آج وہ غزل ادھوری ہے
اب میری کیفیت کو مقطع ہی نہیں ملتا
کتنی معذور میری شاعری ہے

نظم ''سفر'' اس مجموعہ کی ایک طویل نظم ہے۔ یہ دراصل تنہائی کے احساس کی شدت سے بھرا یادوں کا سفر ہے۔ اس میں عروج سے زوال کی عکاسی بھی ہے اور مداحوں کی نفسیات اور ان کی خود پرستی و خود غرضی کا تجزیہ بھی۔ یہاں شاعر اندر سے بالکل ہی ٹوٹ گیا ہے اور اس کے سامنے تلخ تجربات کی یاسیت بکھری پڑی ہے ۔

جو شخص رکھتا تھا کبھی حوصلے تسخیر کائنات کے
آج اس کی حد یہ چہار دیواری ہے
اب نہ کوئی یار نہ دوست
مطلب کی دنیا ساری ہے

لیکن اس کے باوجود شاعر امید کا دامن نہیں چھوڑتا اور مستقبل سے بہر حال مایوس نہیں ہوتا ہے ۔

جو بھول چکے ہیں مجھ کو وہ کل یاد کریں گے
میرے نہ ہونے پر فریاد کریں گے
برسے گا پانی آسماں سے اس دن
میرا آخری سفر زمانے یاد کریں گے

مہاجن کی نظم ''عمل کا صلہ'' میں فلسفہ بھی ہے، موعظت بھری پکار بھی اور تصوف و اخلاق کا رنگ ملیح بھی۔ اس نظم کی خاص بات یہ ہے کہ بعض سطریں فکر اقبال کی یاد دلا جاتی ہیں اور نظم کا ایک بند تو سرتا سر مقولہ کی شان کا حامل دکھائی دیتا ہے ۔

سچائی کی اساس پر بنی عمارت آسمان کو چھوتی ہے
انسان کے کردار کی شناخت
اس کی پاکیزگی سے ہوتی ہے
قسمت کے سودے جو بازاروں میں ہوتے
تو ہر امیر کی تقدیر بلند ہوتی
تیرے ہی عمل کا صلہ ہے جنت یا دوزخ
ویسے نصیب نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی

اس مجموعہ کی نظم ''ساحرؔ'' بھی ایک کامیاب نظم ہے۔ اس میں شاعر نے ساحرؔ لدھیانوی سے اپنی عقیدت اور ذہنی قربت کا بہت ہی برجستہ اظہار کیا ہے۔ اس نظم کا وہ آخری بند خصوصیت سے متوجہ کرتا ہے جس میں ساحرؔ کے مصرعے سمو لئے گئے ہیں ۔

''یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے'' پوچھا کبھی
تو کبھی فکر کو دھوئیں میں اڑانے کی بات کی
''پھر سے اجنبی ہو جانے'' کی التجا کرتے ہوئے
غموں کے دور میں مسکرانے کی بات کی
حلاوت اردو زباں سے واقف بنایا آپ نے
مشکور ہوں اس پتھر کو ثاقب بنایا آپ نے
کرتا ہوں دعا اردو کی نوا تا قیامت رہے
شاعروں کی کہکشاں میں
سب سے اونچا ساحرؔ تیرا نام رہے

مجموعہ ''افکار'' کی طویل نظم ''یادیں'' بھی ایک اچھی کاوش ہے، یہاں شاعر گویا اپنے وطن میں کسی اجنبی کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ اس نظم میں ایک محاکاتی انداز ہے اور شاعر نے بہت چابک دستی سے گاؤں کا بدلتا جغرافیائی اور سماجی منظر و پس منظر دکھا دیا ہے ۔

خوشی کے اسباب کم نہ تھے
ان دنوں میرے احساب کم نہ تھے

مسرت حاصل ہوتی دوستوں کے ساتھ کھیل کر
خوش نصیب تھے
کبھی جو ہنستے تھے دل کھول کر

لیکن اس کے باوجود یہ کہنا چاہیے کہ نظم میں جو ایک طرح کا پچھتاوا ملتا ہے، وہ قاری کے لئے بے اثر نہیں ہوسکتا، پھر یہاں حرماں نصیبی اور بے بسی کا جو اظہار ہے اور جیسے چبھتے ہوئے سوال پر نظم کا خاتمہ ہوا ہے وہ بھی اثر سے خالی نہیں ؎

دولت ملی، عزت ملی
پر چاہت نہ مل سکی
اُس بڑے مکان میں
گھر جیسی راحت نہ مل سکی
تنہائی کے عالم سے ہراساں
اس دل نے پھر پرانے گھر کو یاد کیا
میں نے بھی اپنی خودغرض امیدوں کو
کچھ دیر آزاد کیا
پر بدلے ہوئے منظر نے مجھ سے پوچھا
کس خوشی کی تلاش میں عمر کو برباد کیا

نظم ''دل کی خوشی'' شاعر کے احساسات و جذبات کی مظہر ایک ایسی نظم ہے جس میں بڑی صاف گوئی سے محبوب کی بے وفائی دکھائی گئی ہے

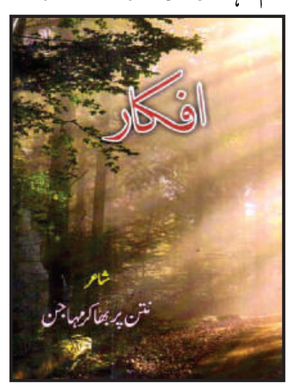

اور یادوں پر مشتمل کئی متحرک تصویریں سامنے لادی گئی ہیں۔ یہ نظم سرتا سر اندرونی یاسیت کی غماز ہے اور اس میں ٹوٹے دل کی جھلک سطر سطر دکھائی دیتی ہے، اسی کے ساتھ یہاں یہ نفسیاتی نکتہ بھی ملتا ہے کہ اعتبار اُٹھ جائے یہ بات دوسری ہے، مگر پیار ختم نہیں ہوتا، بس اتنا ہوتا ہے کہ دل کی خوشی کا انحصار کسی کی آمد پر نہیں رہ جاتا۔

نظم ''تا قیامت'' ایک دعائیہ نظم ہے جس میں محبوب کی ایک جھلک دیکھنے کی تمنا کی گئی ہے اور وقت کے جبر سے ہراساں اور غمزدہ محبوب کو تسلی دی گئی ہے۔ نظم کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ آخری بند کا آخری حصہ اگر سوالیہ سمجھ لیا جائے تو یہ نظم زبردست طنز کی حامل بھی بن سکتی ہے اور ایک آفاقی صداقت کی ترجمان بھی جو تا قیامت سدا جوانی کی خوش فہمی کو اصلیت کا آئینہ دکھاتی ہے ؎

اپنی عمر کے بڑھنے کا غم نہ کر تو
یہ تو وقت کی روانی ہے
تا قیامت رہے گی جو قائم
ایسی تری جوانی ہے

نظم ''واپسی'' بھی ایک بہت ہی عمدہ فلسفیانہ نظم کہلانے کا حق رکھتی ہے۔ اس نظم میں ایک پچھتاوا بھی دکھائی دیتا ہے اور ایک سوال بھی سامنے آتا ہے۔ جب آدمی لالچ کا شکار ہوتا ہے تو واقعی اس کی کیفیت وہی ہو جاتی ہے جسے شاعر نے ان لفظوں میں سمیٹا ہے ؎

زندگی جنت سے دوزخ میں منتقل ہوگئی
جب سے بلائے حرص مجھ پر نازل ہوگئی
شفاف آنکھوں سے
خلوص دل کا پتہ چلتا تھا کبھی
اب لالچ کی سیاہی اس میں شامل ہوگئی
دیکھا تو شامل حال تھا خدا کا فضل
پھر یہ کون سی مشکل ہوگئی
زیادہ کی خواہش میں ہی
میری خوشی زائل ہوگئی

یہ ہے خود احتسابی اور اس سے ملنے والے احساس کا کرب، جس نے شاعر کو اس مقام پر پہنچایا ہے ؎

میرے امروز وفردا کا کیا ہوگا
یہ سوال کاش ستاتا مجھے
راہِ بدی پر خار ملیں گے
خوابیدہ ضمیر کاش بتاتا مجھے
میرے گناہوں کی فہرست شاید طویل ہوگئی

گویا واپسی اب بہت مشکل ہوگئی

نظم ''انقلاب''، اس مجموعہ کی ایک سیاسی نظم ہے جس میں نیتاؤں کی فکر و عمل کا موثر نقشہ کھینچا گیا ہے اور اسے دیش کا المیہ بتاتے ہوئے دولت کی مساوی تقسیم کی آرزو کی گئی ہے ۔

افلاس عوام کو
نام دیتے ہیں یہ مشیت ایزدی کا
لاکھوں وعدے ان کے
پر کام کرتے ہیں مرضی کا
خلا میں معلق ضمیر ان کا
دونوں کانوں سے بہرا ہے
نیت میں بے ایمانی ان کی
اور صاف ستھرا چہرہ ہے

اس مجموعہ کی نظم ''انکشاف''، اصلاً نفسیاتی انکشافات پر مبنی ہے جس میں شاعر نے اپنے ذاتی حوالے سے یہ بتایا ہے کہ سوچ بدلنے سے فراغت ملتی ہے، یاد ماضی کی تلخیوں کو بھلا دینا سکون دل کا احساس لاتا ہے اور خطائیں معاف کر دینے سے مایوسی کا تکدر مٹ جاتا ہے ۔

تلخی یاد ماضی کو دل سے جب اتارا میں نے
احساس سکون دل کا جیسے کیا نظارا میں نے
اپنی سوچ کو جب سے بدلا میں نے
سوئے فراغت پہلا قدم رکھا میں نے

نظم ''آخری دعا''، باپ کی دعا اور نصیحت پر مبنی ایک اخلاقی نظم ہے، جس میں شاعر نے اولاد کے روشن مستقبل پر اپنے یقین کا اظہار کیا ہے اور آخری وصیت کے طور پر کہا ہے کہ ۔

کبھی آپس کا پیار کم نہ کرنا
سچائی کی راہ پر چلنا
کوئی آسودہ مراحل ملے نہ ملے
رہے بھروسہ اس بات پر کہ خدا بڑا کارساز ہے

نظم ''کل اور آج''، میں عصری تناظر میں ماضی وحال کا تقابل پیش کیا گیا ہے۔ یہاں شاعر زمانے کے تجربے سے، بہت ہی دُکھی دل ہے اور کہا جا سکتا ہے اس نظم کے کلائمکس میں شاعر کا سارا درد وکرب سمٹ آیا ہے ۔

ہوتے تھے رشتے مضبوط کبھی چٹانوں کی طرح
آج اپنے بھی پیش آتے ہیں بیگانوں کی طرح
بدلتے وقت نے رشتوں کی چھبی بدل ڈالی
اے بدلے ہوئے زمانے انصاف بھی تیرا خوب ہے
انسان ہی کی شکل آج انسان کے لئے معتوب ہے

''جھوٹی شان''، محاکاتی انداز کی ایک پیامی نظم ہے۔ یہاں شاعر، دوسروں کی دیکھا دیکھی اپنے بیٹے کو بھی امریکہ بھیجنے کا فیصلہ کر لیتا ہے اور اس پر عمل میں بھی دیر نہیں کرتا، لیکن جب حقیقت سامنے آتی ہے اور بات یہاں پہنچتی ہے کہ ۔

کہا جب اس سے 'اب واپس آنا ہے تجھ کو'
تو کہنے لگا 'اب تو یہیں بس جانا ہے مجھ کو'

تب شاعر کی آنکھ کھلتی ہے اور اُسے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ۔

جھوٹی شان کے نقلی سپنے
سچی خوشی نہیں لاتے
جہاز تو آتے ہیں امریکہ سے بہت
پر بیٹے کی خبر نہیں لاتے

نظم ''نئی سحر''، میں خود احتسابی کی شان اور شعور سے بروقت رہنمائی لینے کا نہایت موثر پیام ملتا ہے ۔

یہ جان کر کیوں انجان ہیں ہم
خزاں کے بعد بہار کا زمانہ ہے
کوفت کا احساس دُکھ کا اندیشہ لاتا ہے
آنے والے ہر پل غم کا سندیشہ لاتا ہے
مانو تو خوشی ہے ہر جگہ
مانو تو غم کہاں نہیں ملتا
سچ کہا ہے دانشوروں نے
کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا

نظم ''حسن مجسم''، ایک خوبصورت رومانی تصوراتی نظم ہے۔ اس میں پیکر تراشی کی جھلک بھی ہے اور تجسیم میں تشبیہ کی شان بھی۔ شاعر نے اسے

مبالغہ کے حسن سے بھی بخوبی سجایا ہے اور بات یہاں تک پہنچائی ہے کہ ؎

راہِ جنت تیری ہی گلی سے گزرتی ہوگی
جہاں پڑے ہوں تیرے نقشِ قدم
وہ گرد بھی بڑی قیمتی ہوگی
تیرے انداز کا ثانی تو ملنے سے رہا
کبھی تو بھی تو خود پر رشک کرتی ہوگی

مزید یہ کہ اس نظم میں ''خوبصورت ہو جو قاتل تو قضا بھی حسین ہوتی ہے۔'' جیسی سطر بہرحال مقولہ کی شان رکھتی ہے اور قاری کو دیر تک ملتفت بنانے میں کامیاب نظر آتی ہے۔

زیرِ نظر مجموعہ کی آخری نظم ''شمع روح'' ایک تصوراتی نظم ہے، جس کا خاتمہ اس فلسفیانہ انکشافی بیان پر ہوتا ہے کہ ؎

موت ایک بڑا پڑاؤ ہے
ایک جسم کے ختم ہونے کا
روح کی تقویت ہی حاصل ہے زندگی کا
وجود روح تو لازوال ہے
انکشاف ہوا کہ جسم بس ایک وسیلہ ہے
پر روح سے سرمد کوئی سچ نہیں

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ زیرِ تبصرہ مجموعہ میں ''بھوک'' کی جگہ ''بھوکھ''، ''سرمایہ'' کی جگہ ''سرمایا''، ''صناعی'' کی جگہ ''صنائی''، ''آنسوؤ'' کی جگہ ''آنسوں''، ''ذرا'' کی جگہ ''زرا''، ''ایوانوں'' کی جگہ ''ایونوں''، ''متلاطم'' کی جگہ ''مطلاطم''، ''رعب'' کی جگہ ''روب''، ''بددور'' کی جگہ ''بدور''، ''سہی'' کی جگہ ''صحیح''، ''مشال'' یا ''مشعل'' کی جگہ ''مشعال'' جیسی مثالیں تکدر کا باعث بنتی ہیں۔ ''سمجھ آیا'' (ص۴۳) ''اپنے تحویل'' (ص۳۱) ''سرمد احساس'' (ص۳۱) ''دل کی خوشی آج تیری آمد پہ انحصار نہیں'' (ص۲۳) ''جذباتوں'' (ص۳۱) ''تیرا چشم'' (ص۴۱) ''کہکشاں نیا'' (۴۲) ''تو کوئی پوچھے ان سے، جو زندگی لٹ گئی تیری (بجائے تمہاری) الفت پر'' (ص۱۰) جیسی مثالیں قواعدی سقم کی شہادت دیتی ہیں۔

شاعر نے ''میری ہر کوفت کا سبب میں نے زمانے کو سمجھا (ص۳۰) اور ''ایک غیر ملک کو میرا فرزند بیچ دیا میں نے (ص۳۷) میں ضمیر مشترک کی بجائے ضمیر شخصی سے جس طرح کام لیا ہے، اسے بھی مستحسن اور معیاری اردو کا لہجہ نہیں کہا جا سکتا۔

اتنا ہی نہیں بلکہ شاعر نے ''اپنی معذور زندگی پر انصاف کیا میں نے'' (ص۳۱) جیسی سطر میں پری پوزیشن کے استعمال میں بھی محاوراتی صحت کا خیال نہیں رکھا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ''ہیں'' کی جگہ ''ہے'' اور ''کہ'' کی جگہ ''کے'' یا ''ترا'' کی جگہ ''تیرا'' جیسی غلطیاں جگہ جگہ نہ صرف کمپوزنگ کے صدقے در آئی ہیں بلکہ شاعر نے یوں بھی اپنے کلام پر نظرِ ثانی کا حق ذرا کم کم ہی ادا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں کہیں کہیں تفصیل زیادہ ہوگئی ہے اور سطریں توڑنے کا اہتمام ذرا کم رہ گیا ہے۔ پھر یہ کہ بعض سطروں میں مفہوم کی ادائیگی کے لحاظ سے الفاظ زیادہ آگئے ہیں مثلاً ''ہر مداح کے دل میں رہتا تھا میں ان دنوں'' کے معاً بعد کی سطر ''سب کے ہونٹوں پہ بس میرا ہی نام تھا ان دنوں'' (ص۱۱) میں ''ان دنوں'' کا ٹکراؤ زیادہ ہی کہا جائے گا۔ اسی طرح ''والدین کے زیرِ سایہ میں'' (ص۱۸) آخری لفظ صریحاً زیادہ ہے۔ بعض جگہ لفظ کے استعمال کی صحیح صورت بھی مجروح ہوئی ہے مثلاً ''پر دل کی خوش آج تیری آمد پر انحصار نہیں'' (ص۲۳) میں یا تو ''دل کی خوشی کا'' محل تھا یا ''انحصار'' کی جگہ لفظ ''منحصر'' کے استعمال کا۔

زیرِ نظر مجموعہ ''افکار'' کے مذکورہ پہلو ہزار کمزور سہی، لیکن اس کے باوجود اس وقت، تبصرہ لکھنے والے کی نگاہ میں یہ مجموعہ بہت ہی قیمتی ہے اور اسے اسم بامسمّٰی کہنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہو رہی ہے، اس لئے کہ یہ مجموعہ بہرحال ادب کے کسی سکہ بند اور مشتاق جغادری شاعر کے قلم سے پکی روشنائی میں نہیں آیا ہے، بلکہ یہ اردو کی طرف پرشوق رجحان رکھنے والے ایک قلمکار کی پہلی کاوش ہے اور یقیناً اسے مصنف کے شناس نامہ سے الگ کرکے دیکھنا کسی بھی صورت میں قرینِ انصاف نہیں۔ یہاں جو تسامحات دکھائے گئے ہیں وہ صرف علمی افادہ کی خاطر ہیں، ورنہ ایسی محنتیں بہرصورت حوصلہ افزائی کی لازماً حقدار ہوتی ہیں اور امید ہے کہ تن پر بھاکر مہاجن کو ان کے اس مجموعہ ''افکار'' کے حوالے سے وہ حق ضرور ملے گا جو ان کے حوصلوں میں نئی تازگی، توانائی اور بہتری لانے کا موجب ہوگا۔ ❁❁

وفیات

ننگی دوپہر کا سپاہی چل بسا

پٹنہ : گزشتہ دنوں منگل، ۷رمئی ۲۰۲۴ء کو معروف افسانہ نگار سلام بن رزاق اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا اللہ الخ وہ طویل عرصہ سے بیمار چل رہے تھے اور کچھ دنوں سے اپنی بیٹی کے گھر، واقعی نوی ممبئی میں رہنے لگے تھے اور وہیں انہوں نے آخری سانس لی اور بعد نماز مغرب بڑے قبرستان مرین لائنز میں ان کا جسد خاکی سپرد لحد ہوا۔

سلام بن رزاق کا آبائی وطن کوکن تھا۔ وہ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۵رنومبر ۱۹۴۱ء کو مہاراشٹر کے ضلع رائے گڑھ میں واقع قصبہ پنویل میں انہوں نے آنکھیں کھولیں اور بچپن ہی میں ماں کی آغوش شفقت سے محروم ہو جانے کے بعد، نہایت غربت کے عالم میں، اپنی پھوپھی کے زیر عاطفت پرورش پایا اور اپنے شوق اور محنت سے تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۶۰ء میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کرنے کے بعد تقریباً ۳۶ سال وہ درس وتدریس کے پیشے سے منسلک رہے اور ۱۹۹۹ء میں اسکولی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

سلام بن رزاق نے یوں تو ابتدائی دور میں شاعری بھی کی، پھر بعد کے زمانے میں بچوں کا ادب اور تنقیدی مضامین بھی لکھے، تراجم کی دنیا میں بھی قدم رکھا، ڈرامے بھی تصنیف کئے، ریڈیو فیچر بھی لکھا اور فیچر فلمیں بھی بنائیں، لیکن درحقیقت جس صنف ادب کے حوالے سے انہیں مثالی شہرت و مقبولیت اور دائمی شناخت ملی، وہ افسانہ کی صنف ہے۔ سلام بن رزاق کا پہلا افسانہ ''رین کورٹ'' ۱۹۶۲ء میں چھپا تھا۔ اس کے بعد ان کا پہلا مجموعہ ''ننگی دوپہر کا سپاہی'' ۱۹۷۷ء میں اور دوسرا مجموعہ ''معبر'' ۱۹۸۷ء میں منظر عام پر آیا، پھر ان کے تیسرے افسانوی مجموعہ ''شکستہ بتوں کے درمیان'' کی اشاعت ۲۰۰۱ء میں اور چوتھے افسانوی مجموعہ ''زندگی افسانہ نہیں'' کی اشاعت ۲۰۱۲ء میں ہوئی۔ مذکورہ افسانوی مجموعوں کے علاوہ سلام بن رزاق کی مترجمہ کتاب ''ننھے کھلاڑی'' اور ''ماہم کی کھاڑی'' بھی بہت مشہور ہے۔ مراٹھی سے ترجمہ شدہ یہ دونوں کتابیں بچوں کے ادب کا حصہ ہیں۔

سلام بن رزاق کا شمار اُردو کے اُن مقبول اور خوش بخت قلم کاروں میں ہوتا ہے جو اپنی ادبی خدمات کی بدولت نہ صرف ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور دیگر اعزازات وانعامات سے نوازے گئے، بلکہ اُن کے فن پر، ان کی زندگی میں ہی مقتدر ادبی رسائل وجرائد نے اپنے خصوصی نمبر اور خصوصی گوشے بھی شائع کئے اور جامعات میں اُن کی ادبی خدمات پر ایم۔فل اور ڈاکٹریٹ کے مقالے بھی لکھے گئے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان کے افسانوی مجموعوں کا ہندی، مراٹھی، تیلگو اور پنجابی، انگریزی، روسی، ازبک اور جرمن زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا اور اُن کی پندرہ سے زیادہ کہانیاں داخل نصاب ہونے کا امتیاز بھی رکھتی ہیں۔

''ایک جھوٹی رسچی کہانی''، ''گیت'' اور ''ایک ننھی سی پری'' سلام بن رزاق کی وہ باقیات ہیں جو آن لائن پروگرام اور اسٹیج کے ذریعہ ہمیں ملی

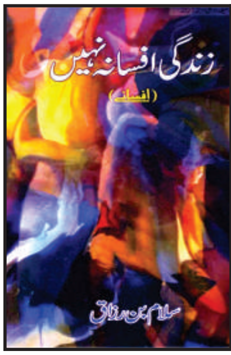

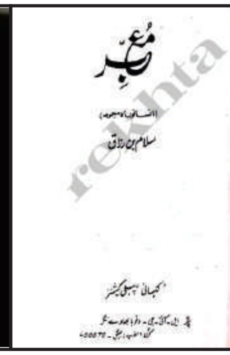

ہیں۔ بلاشبہ سلام بن رزاق ۱۹۷۰ء کے بعد سامنے آنے والا اردو افسانے کا ایک اہم نام شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے تجرباتی افسانہ نگاری کے حاوی رجحان کا زمانہ پایا، مگر یہ اُن کا بڑا کمال ہے کہ عمیق مطالعہ اور وسیع مشاہدے کے ساتھ انہوں نے محروم آبادیوں کے سچے اور مخلص فکشن نگار کی حیثیت سے اپنی روشن شناخت بنائی۔ وہ یقیناً ایک کامیاب مترجم ہی نہیں، افسانہ نگاری کی دنیا میں تمثیلی پیرایہ بیان کو وسعت دینے والے بڑے باہنر فن کار اور تاریخ وتہذیب کے بڑے نباض بھی تھے، ان کے یہاں فرد کی ذاتی سوچ اور نجی مجبوری کو پیش کرنے کا ایک خاص انداز ملتا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوی مجموعوں کی ٹائٹل کہانیاں نہ صرف مشہور ہوئیں، بلکہ سلام بن رزاق کے فن کا استعارہ بھی بن گئیں، یہاں تک کہ وہ کبھی ''ننگی دوپہر کا سپاہی'' کہلائے اور کبھی ''شکستہ بتوں کے درمیان''، ''کالے ناگ کے پجاری''۔ اردو افسانے نے انہیں کبھی ''ابراھیم سقہ'' کے روپ میں دیکھا، کبھی ''معبر'' اور ''بجوکا'' کے روپ میں، کبھی ان کے یہاں ''ندی'' کا بہاؤ ملا اور کبھی ''آواز گریہ'' سنائی دی، کبھی وہ کوئی ''سبق'' لے کر آئے، کبھی ''بے چہرہ بھیڑ'' میں دکھائی دئے، کبھی ان کے ''خصی'' اور ان کے ''اداکار'' سے ملاقات ہوئی، کبھی وہ ''حلالہ'' کی باتیں کرتے نظر آئے اور کبھی اپنے ''اندیشہ'' اپنی ''چادر'' اور اپنی ''کنیز'' کے ساتھ ''انجام کار'' تک پہنچے اور یہ گہری بات بتا گئے کہ ''زندگی افسانہ نہیں''۔ سلام بن رزاق کی رحلت، اردو فکشن خصوصاً افسانہ نگاری کی تاریخ کے لئے ایک ایسا صدمہ ہے جس کا اثر یقیناً تادیر رہے گا۔

آہ! شبر امام

پٹنہ: گزشتہ دنوں ۱۷ر مئی ۲۰۲۴ کو معمر ومعروف ادیب ودانشور، انشائیہ نگار، تاریخ نگار اور ناول نگار، ناقد ومحقق، صحافی، خاکہ نگار اور متعدد مذہبی، فکری واصلاحی اور علمی کتابوں کے مصنف جناب شبر امام اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔ انا للہ الخ مقامی ہسپتال میں انہوں نے دیر رات گئے آخری سانس لی اور جمعہ کے دن باؤلی مسجد پٹنہ سیٹی میں اُن کی پہلی نماز جنازہ ہوئی اور پھر ان کا جسد خاکی اُن کی آبائی بستی پالی لے جایا گیا، جہاں دوسری نماز جنازہ امام بارگاہ علی نگر پالی میں ادا کی گئی اور وہیں آبائی قبرستان میں آسودۂ لحد ہوئے۔

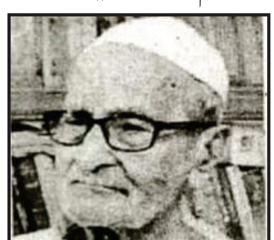

جناب شبر امام کا پورا نام سید شبر امام رضوی تھا، لیکن ادبی وعلمی دنیا میں وہ صرف ''شبر امام'' کے نام سے معروف تھے۔ ان کے والد کا نام سید فضل امام رضوی ابن سید وحید حسین رضوی اور والدہ کا نام کنیز کبریٰ بیگم بنت شاہ اصغر حسین تھا۔ جناب شبر امام کی تاریخ پیدائش یکم جنوری ۱۹۳۹ء اور جائے پیدائش، آبائی وطن علی نگر پالی، ضلع جہاں آباد ہے۔ وہ ایک متمول اور بارسوخ زمیندار خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور بنیادی ذریعہ معاش کاشتکاری تھا۔ شبر امام محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ سیٹی سے میٹرک اور اورینٹل کالج، پٹنہ سیٹی سے آرٹس میں انٹر کے بعد اپنا تعلیمی سلسلہ آگے نہیں بڑھا سکے اور زمینداری کے مقدمات کی الجھنوں اور گھر بار کی ذمہ داریوں میں ہی ان کا وقت عزیز گزرتا چلا گیا، یہاں تک کہ ۱۹۸۱ء میں کئی چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر جب ان کی اہلیہ بھی رخصت ہو گئیں تو انہوں نے جناب ناصر زیدی کے مشورے اور ان کی حوصلہ افزائی سے اپنے مشاغل وقت کے لئے ایک نئے میدان عمل کا انتخاب کر لیا اور کہا جا سکتا ہے کہ جب تحریر وتصنیف کی دنیا میں قدم رکھا تو وفاداری بشرط استواری کی ایک مثال قائم کر گئے۔

جناب شبر امام کی ادبی زندگی تقریباً نصف صدی پر محیط ہے۔ ان کا پہلا مضمون ''رحمۃ اللعالمین'' روزنامہ ''صدائے عام'' پٹنہ میں شائع ہوا تھا، یہ ۱۹۷۸ء کی بات ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور قلم کاغذ سے اپنا رشتہ آئے دن مستحکم بناتے رہے۔ اُس زمانے میں پٹنہ سے جناب ناصر زیدی پندرہ روزہ ''الناصر'' نکالتے تھے، اس رسالہ میں جناب شبر امام کی اشاعت یافتہ بہت ساری تحریریں محفوظ ہیں۔ یہی وہ دور ہے جب افسانہ نما تحریریں، مضامین اور انشائیے انہوں نے تواتر سے لکھے جو مختلف روزناموں کی زینت بنتے رہے۔

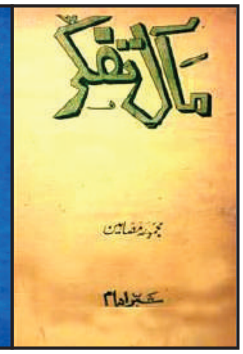

جناب شبر امام ایک فعال اور تحریکی آدمی تھے، یہی وجہ ہے کہ ایک طرف ۱۹۷۹ء میں انہوں نے عائلی اور معاشرتی مسائل کی افہام وتفہیم اور ان کے تعلق سے عصری تناظر میں معقول ذہن سازی کے لئے ''حسینی سماج'' نامی ادارہ قائم کیا اور دوسری طرف اس کے ایک سال بعد ۱۹۸۰ء میں ''حسینی انقلاب'' کے نام سے ایک اردو ہفتہ وار بھی جاری کیا جس کی اشاعت کم وبیش چار برسوں تک ہوتی رہی اور اس طرح جناب شبر امام کی ملی، سماجی اور ادبی وصحافتی کارگزاریوں کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔

جناب شبر امام کی پہلی کتاب کا نام ''مآل تفکر'' ہے جو ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی تھی اور وہ اپنی آخری کتاب ''تذکرہ وتبصرہ'' پریس کے حوالے کرنا ہی چاہتے تھے کہ ان کا وقت موعود آ پہنچا۔ جناب شبر امام اگر چہ بظاہر اعلیٰ جامعاتی اسناد نہیں رکھتے تھے، لیکن وہ اردو، فارسی اور انگریزی سے بخوبی واقف تھے۔ انگریزی زبان میں ان کی کئی کتابیں موجود ہیں اور جہاں تک جناب شبر امام کی اردو تصنیفات وتالیفات کا معاملہ ہے، ان کی مجموعی تعداد ڈھائی درجن سے متجاوز ہے۔ انہوں نے جہاں بصورت تالیف ''اہل بیت اور سنت نبوی'' (۲۰۱۸ء) ''اظہار عقیدت'' (۲۰۱۱ء) ''کشکول'' (۲۰۱۹ء) ''نور الابرار'' (۲۰۱۹ء) اور ''حدیث بے خبری'' (۲۰۱۹ء) سے نوازا ہے اور اس طرح سید حسن عباس نونہری اور بنگلور کے مرزا عباس علی، مرزا محمد شفیع بیگ اور محمد حبیب احمد تمکوری کی مذہبی واعتقادی اور تقدیسی شاعری پر مبنی کاوشوں کو لباس تدوین سے مزین کیا ہے، وہیں دینیات کے تعلق سے اپنی تصانیف ''انوار بصیرت'' (۲۰۰۰ء) اور ''حقا کہ بنائے لا الہ است'' (۲۰۰۳ء) بھی منظر عام پر لایا ہے۔ علاوہ ازیں انگریزی میں "Syeds of Ghazipur" (۲۰۱۱ء-۲۰۱۳ء) بھی دو جلدوں پر مشتمل ان کی ایک اہم مرتبہ کتاب ہے۔

ادبیات کے باب میں شبر امام کی تصانیف کا موضوعی اور صنفی تنوع بھی نہایت لائق التفات ہے۔ ''بہار کا میر امن'' (۲۰۱۳ء-۲۰۱۴ء) ''ایک جہاں اپنا بھی''، ''رقص حیات'' (۲۰۱۸ء) ''جنبش قلم'' اور دو حصوں پر مشتمل ''شاخ بریدہ'' (۲۰۱۵ء) جیسی کتابیں اگر ایک طرف سوانحی خاکہ نگاری میں جناب شبر امام کی صلاحیتوں کا پتہ دیتی ہیں تو دوسری طرف ان کے افسانوں کا مجموعہ ''تلاش'' (باردوم ۲۰۱۷ء) انشائیوں کا مجموعہ ''تلخیاں'' (۱۹۹۵ء و ۲۰۱۹ء) اور مضامین کا مجموعہ ''کشکول'' (۲۰۰۰ء) بھی تخلیقی ادب میں ان کی خدمتوں پر شاہد ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے اپنے دو ضخیم ناول ''شاہین'' (۱۹۹۶ء) اور ''جب گاؤں جاگے'' (۲۰۰۵ء) سے بھی اردو فکشن کو نوازا ہے۔

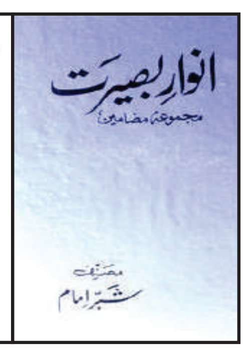

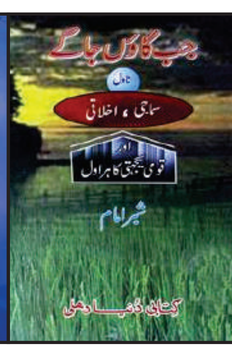

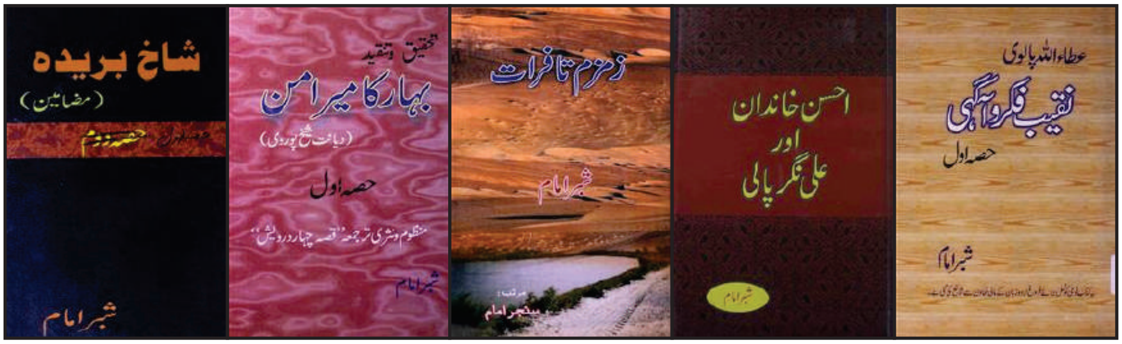

جناب شبر امام تخلیقی ادب کے دوش بدوش تحقیقی اور تنقیدی ادب کی تصنیف میں بھی اپنی خاص شہرت وشناخت رکھتے تھے۔انہوں نے ''عطاء اللہ پالوی: نقیب فکروآ گہی'' کے نام سے آٹھ جلدوں میں جو کتاب لکھی ہے وہ ان کی ایک اہم یادگار ہے اور اسی حوالے سے بجا طور پر انہیں ''ماہر پالویات'' کہا جاتا ہے۔ اس کتاب کی پہلی جلد ۲۰۰۸ء میں اور آخری جلد ۲۰۱۷ء میں چھپی تھی۔اس کے علاوہ دو جلدوں پر مشتمل ان کی کتاب ''بہار کا میر امن: دیانت شیخ پوروی'' (۱۴-۲۰۱۳ء) بھی ایک اہم تحقیقی کاوش ہے، اس میں انہوں نے دیانت شیخ پوروی کے ترجمہ ''باغ و بہار'' کو شائع کیا ہے اور یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ میر امن دہلوی کا طویل مدت تک عظیم آباد میں قیام رہا۔اسی طرح شبر امام کا ایک اور تحقیقی کارنامہ ''میر حسین عطا خاں تحسینؔ'' بھی ہے جس میں انہوں نے یہ تحقیق پیش کی ہے کہ ''نوطرز مرصع'' کا وجود عظیم آباد ہی میں ہوا اور یہیں اس کی ترتیب بھی ہوئی۔تحقیق اور تنقید و تجزیہ کے تعلق سے شبر امام کی مرتبہ کتاب ''فسانہ ہمت'' (دسمبر ۲۰۲۰ء) بھی اہمیت سے خالی نہیں، جس میں انہوں نے امداد امام اثرؔ کے ناول ''فسانہ ہمت'' پر کئی خاص پہلو سے نظر ڈالی ہے اور ابن صفی کی جاسوسی ناول نگاری کا اس سے قریب تر اور ممکنہ ذہنی و استفاداتی رشتہ دکھایا ہے۔

سید شبر امام تاریخ نگاری سے بھی بڑا شغف رکھتے تھے، چنانچہ انہوں نے ''میری بستی، میرے لوگ'' (۲۰۱۹ء) کے نام سے علی نگر پالی کی تاریخ کے علاوہ ''احسن خاندان اور علی نگر پالی'' (۲۰۱۲ء) جیسی کتابیں لکھ کر اس کا بہترین ثبوت دیا ہے۔

شبر امام کی علمی وادبی خدمات پر ''امتیاز میرؔ'' ایوارڈ، آل انڈیا میر اکادمی لکھنؤ کے علاوہ بہار اردو اکادمی پٹنہ کی جانب سے بھی انعامات دئے گئے اور ضلع انتظامیہ جہاں آباد ((زبان اردو سیل) کی جانب سے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے بھی انہیں نوازا گیا۔ جناب شبر امام کی شخصیت اور ان کے علمی و ادبی کارناموں پر شاہد رحیم کی کتاب ''عصر جدید کا ممتاز ادیب: شبر امام'' ۲۰۱۰ء میں اور سید خورشید احمد کاکوی کی کتاب ''شبر امام کی نثر نگاری'' ۲۰۱۲ء میں شائع ہو چکی ہے جو ان کی زندگی، شخصیت اور خدمات کے بیشتر گوشے سامنے لادیتی ہے۔

جناب شبر امام ہمارے اُن قلم کاروں میں تھے جو اکادمی مجلّہ ''زبان وادب'' کو اپنی پیرانہ سالی کے باوجود، آخرین ماہ وسال تک اپنی نگارشات سے سرفرازی بخشتے رہے،ان کا مقالہ: ''بہار کا نابغہ زمن: مناظر عاشق ہرگانوی'' اکتوبر ۲۰۲۱ء کے شمارے میں اور ''عندلیب شادانیؔ، عطاء اللہ پالوی اور جگر مرادآبادی'' جولائی ۲۰۲۲ء کے شمارے میں دیکھا جا سکتا ہے۔اپنے موخرالذکر مقالہ کی آخری سطروں میں انہوں نے بڑی دلسوزی کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ:

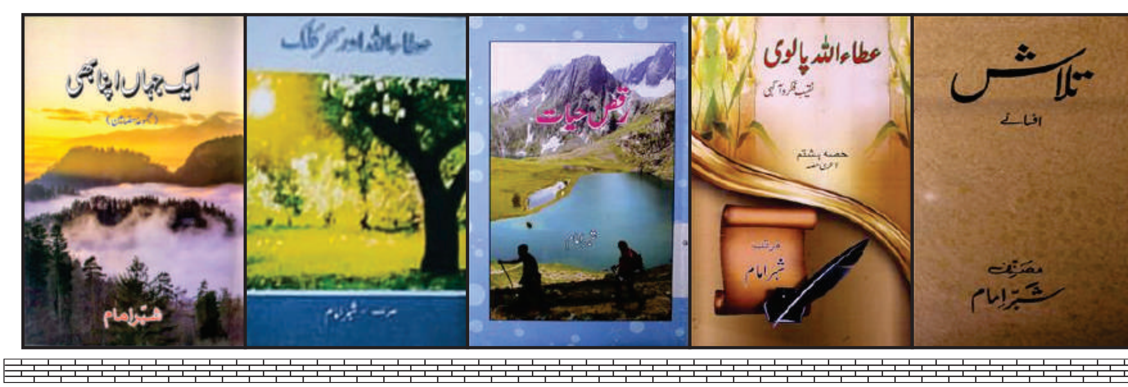

''افسوس کہ اردو نقد وادب کی دنیا، ہمیشہ ہی اعلیٰ تدریسی وانتظامی مناصب پر رہنے والوں کو تسرجیحاً اعلیٰ استعداد کا حامل بھی مان لیا کرتی ہے اور گویا اپنے خودساختہ مزعومات کا خود ہی شکار ہو جاتی ہے، مگر زمانہ بڑا منصف ہے، وہ بوریہ نشینوں کو بھی اُن کا حق دلا دیتا ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ آج بھی ہم جناب پالوی کی ناقدانہ نظر کے اعتراف واقرار پر مجبور ہیں۔''

اس کے علاوہ ''زبان وادب'' جنوری ۲۰۲۳ء کے شمارے میں ''مراثی شادؔ میں تازہ خیالی اور ناقدانہ لہر'' کے عنوان سے بھی ان کا ایک وقیع مقالہ اشاعت یافتہ ہے، ذیل میں حاضر ہے اس مقالہ کا ایک اقتباس:

''شادؔ عظیم آبادی اگر چہ اپنی ڈھلتی عمر میں دوستوں کے اصرار سے مرثیہ گوئی کی طرف آئے، مگر ان کا کمال یہ رہا کہ وہ اس صنف کے لئے تازہ تنقیدی شعور بھی ساتھ لائے۔ شادؔ نے مرثیوں میں ''زباں پسند'' اور ''حکمائے زماں پسند'' باتیں لانے کی جو سفارش کی ہے وہ کچھ معمولی اور کچھ کم جرأت مندانہ سفارش نہیں۔ مرثیہ کی صنف بعض وجوہ سے یا یوں کہہ دیا جائے کہ محض بین وبکا پسندی کے روایتی اور تقلیدی رجحان کے باعث مذاق زمانہ سے نہایت خاموشی کے ساتھ کٹنے بھی لگی تھی اور عصری تقاضوں کے تناظر میں اس کی افادیت بھی معرض خطر میں پڑ جانے کے قریب تھی۔ یہ تو شادؔ کا احسان ہے اور بڑا احسان کہ دریائے مراثی میں فکر وفن کا جو یک گونہ جمود آ چلا تھا، اُسے انہوں نے تازہ تنقیدی لہروں سے آشنا کر دیا۔ وہ اگر ''ذائقہ طبع'' بچائے رکھنے کی بات کرتے ہیں اور یاد دلاتے ہیں کہ ''اتنا نمک رہے کہ مزہ تلخ ہو نہ جائے'' تو یہ اصل میں اعتدال وتوازن اور ضرورت شناسی کے بھولے ہوئے سبق کو یاد دلانے کے مصداق ہے۔ بیشک رثائی کلام جو آغوش فصاحت میں آسودہ حال ہو کر، تقاضائے بلاغت کی فہم سے بے نیاز ہو چلا تھا، اُسے اس آفت فکر وفن سے بچانے کا سہرا شادؔ عظیم آبادی کے سر ہے۔ بظاہر تازہ خیالی خواہ کتنی ہی کیوں نہ ہو، وہ اگر فطرت اور اصلیت سے کٹتی چلی جائے تو اس کا کوئی مول نہیں ہو سکتا، یہ نکتہ شادؔ کی نگاہوں سے اوجھل نہ تھا، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے محض لفظی اور تقلیدی منظر وپس منظر کی بجائے عصری اور اصلی تناظر میں تازہ خیالی کو سمجھنے اور برتنے کی طرف توجہ دلائی اور روایات صحیحہ اور مسائل مصدقہ سے کام لینے اور انہیں سامنے لانے کا مزاج و ماحول بنانے پر زور دیا اور اس کی وضاحت کے لئے ان کمزور پہلوؤں کی مودبانہ ومخلصانہ نشاندہی میں بھی کچھ تامل اور تردد محسوس نہیں کیا جو وقت کے دو بڑے مرثیہ نگاروں کے یہاں پائے جا رہے تھے۔ نظریاتی لحاظ سے اصلاح مراثی کے لئے شادؔ نے جو آواز اٹھائی، اس میں سرسید تحریک کے تنقیدی افکار کا خاموش اثر ونفوذ دیکھا جا سکتا ہے اور یہ انداز خاص موازنہ انیسؔ ودبیرؔ کی بازگشت صاف صاف سنی جا سکتی ہے۔ شادؔ نے ایک شعوری اور عصری تجرباتی فیصلے کے ساتھ مرثیہ کے روایتی اکتسابات اور رجحانات پر ناقدانہ نظر ڈالی اور اس صنف کے جملہ اجزائے ترکیبی میں اپنے تنقیدی افکار سے نئی لہر پیدا کر دی۔''

❀❀❀

☆ ''زبان وادب'' کا شمارہ بابت مئی ۲۰۲۴ء ملا۔ سرورق اور پس ورق کو دیوان دلؔ عظیم آبادی کے قلمی اور مطبوعہ صفحات کے عکس سے آراستگی کا آپ نے جو اہتمام اِس بار کیا ہے، وہ بہت برجستہ اور بہت ہی بامعنی کہلانے کا حق رکھتا ہے، پھر دونوں اندرونی سرورق بھی صفیرؔ بلگرامی اور پرویزؔ شاہدی کی تصویر، سوانحی پیراگراف اور رباعیات سے بحسن تمام مزین ہیں۔ آپ کا داریہ ''حرف آغاز'' ہمیشہ کی طرح اس بار بھی تعارفی عطر بیان کے مصداق محسوس ہوا۔ میرے خیال میں زیرنظر شمارے کا سب سے اہم حصہ وہی ہے جو ''ذکر دلؔ'' کے تحت شامل ہوا ہے۔ اس نے بجاطور پر اس شمارے کو بہت خاص اور بہت دستاویزی بنادیا ہے، اس لئے بھی کہ محمد عابد دلؔ عظیم آبادی پر کہیں کہیں بس تبرک ہی کی حد تک کچھ پڑھنے کو ملتا ہے۔ ایسی صورت حال میں جناب محمد شوکت جمال خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنے مقالہ میں ''دلؔ اور دیوانِ دلؔ: ایک مطالعہ'' کے عنوان سے قریب قریب سبھی ضروری اور متعلقہ باتیں سمیٹ لی ہیں اور پھر ''دیوان دلؔ کی رباعیاں: ایک جائزہ'' میں سیدہ حشمت آرا نے بھی اپنا موضوع، تشنۂ بیان نہیں چھوڑا ہے۔ لفظ ''دل'' کا عدد ۳۴ ہے اور اس رعایت سے ان دونوں مقالوں کے بعد دلؔ عظیم آبادی کے ۳۴، اشعار کی کہکشاں بھی بڑے اہتمام کے ساتھ سجادی گئی ہے۔ ''مقالات'' کے تحت ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کا مقالہ ''بہار کا پہلا ناول نگار'' اپنے موضوع پر حاصل شمارہ ہے جس کے مطالعہ سے شادؔ عظیم آبادی کی ناول نگاری کے سارے کیف وکم آئینہ ہوجاتے ہیں۔ اس حصہ کے دیگر مقالے بھی اپنے اپنے موضوعات پر لائق مطالعہ ہیں اور پھر جہاں تک مشمولہ ''افسانے'' اور ''انشائیہ'' کا معاملہ ہے، ان کے بارے میں جو کچھ آپ نے لکھا ہے، ان کا راست مطالعہ بہرحال اس کی تصدیق کردیتا ہے، البتہ اتنا لکھنے کی خواہش ضرور ہورہی ہے کہ ڈاکٹر شاہد فروغی نے اپنی کہانی ''لیکھک'' کو بامقصد کلائمکس تک لانے کے لئے جس طرح مسلسل اتفاقات کا سہارا لیا ہے، وہ ذرا دیر ہی کے لئے سہی، اس کہانی کا کمزور پہلو محسوس ہونے لگتا ہے اور ''بیر کا پیڑ'' کے آغاز میں لگ بھگ سوا صفحہ تک اختر کاظمی نے جو کچھ لکھا ہے، وہ اپنی جگہ اٹل سچائی ضرور ہے، مگر فنی لحاظ سے یہ حصہ بھی بہرحال محل نظر ہی کہلائے گا، اسے وہ اگر دو چار سطروں تک رکھتے تو تاثیر دوچند ہوجاتی۔ اس شمارے کا منظوماتی حصہ بھی بہت پسند آیا۔ خاص طور سے طلحہ رضوی برقؔ اور آثرؔ فاطمی کی رباعیاں اور مصداقؔ اعظمی کے قطعات نے کافی محظوظ کیا۔ ڈاکٹر شادابؔ ذکی بدایونی کے نعتیہ مجموعہ ''سرکار کی باتیں'' پر ڈاکٹر مجیر احمد آزادنے بڑا ہی اچھا تبصرہ لکھا ہے اور ڈاکٹر احسان شامؔ کے شعری مجموعہ ''ریاض فکر'' پر جناب شکیلؔ سہسرامی نے جو تبصرہ لکھا ہے، وہ بھی بہت جامع اور متوازن ہے اور ہاں! ''انسانی ہاتھ'' کے عنوان سے ص ۶۷ پر آپ نے جو فیلر دیا ہے، وہ تو واقعی بڑے غضب کی تحریر ہے اور ماننا پڑتا ہے کہ سردار جعفری کی فکر ونظر میں کتنی گہرائی، کتنا خلوص اور کتنی سنجیدگی تھی۔ زیادہ خدا حافظ!

(ڈاکٹر) شائستہ خاتون، پٹنہ

☆ ''زبان وادب'' کا تازہ شمارہ مئی ۲۰۲۴ء پچھلے ہفتہ نظرنواز ہوا۔ زیرنظر شمارے کو ''ذکر دلؔ'' اور اسی مناسبت سے عکوسِ دیوان کے ساتھ جس انداز میں رنگینی اور خوبصورتی ہی نہیں، برجستہ دستاویزی معنویت دی گئی ہے، وہ بجائے خود مسرت افزا اور حیرت افزا ہی نہیں، مجھ جیسے قاری کے لئے بہت معلومات افزا بھی ہے۔ جوششؔ اور دلؔ دونوں بھائیوں کا ایک ساتھ ذکر تو آتا ہے، مگر دلؔ کے تعلق سے شاید باید ہی کہیں کہیں اور وہ بھی کبھی کبھی ایک آدھ صفحہ مشکل سے دیکھنے کو ملتا ہے، لیکن آپ نے تو خیر سے آٹھ صفحات اور بھی رنگین اور پُر عکوس صفحات سے نواز دیا ہے، اس علمی سوغات کا بار بار شکریہ! کہنے کو تو یہاں بس دو ہی مقالے ہیں اور دلؔ کے ۳۴، اشعار پر مشتمل دو صفحے، لیکن اِن سے بہرصورت دلؔ کی شاعری کا جہاں آئینہ ہوجاتا ہے۔

جناب محمد شوکت جمال نے اپنے وقیع مقالہ ''دلؔ اور دیوانِ دلؔ: ایک مطالعہ'' میں موضوع کے قریب قریب سبھی پہلو کا اجمالاً، مگر بڑی جامعیت کے ساتھ احاطہ کرلیا ہے اور یہ بھی کہ محمد عابد دلؔ کے خاندان کی تفصیل میں جانے کی بجائے ان کے نظریہ سخن اور موضوعات وسبک کے تعلق سے ضروری نکات کا اندراج ترجیحی طور پر اختیار کیا ہے، مزید یہ کہ محولہ اشعار بھی بہت برجستہ ہیں۔ سیدہ حشمت آرا نے ''دیوان دلؔ کی رباعیاں: ایک جائزہ'' میں بھی اپنے موضوع کو بہت سنبھال کر اور بہت قاعدے سے سپردِ قلم کیا ہے۔ صفحہ ۱۰ اور صفحہ ۱۱ پر دلؔ کے اشعار کا انتخاب، مطلع، درمیانی اشعار اور مقطع میں تخلص بقید صدر، حشو، عروض، ابتدا اور عجز نے عجیب تنوع کا احساس دلایا۔ خصوصاً عجز میں تخلص کا استعمال تو شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتا ہے جو دلؔ کے یہاں مشہود ہورہا ہے۔ واقعی بڑے شاعر کی ہر بات بڑی ہوتی ہے۔ ''مقالات'' کے ذیل میں ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کا مقالہ ''بہار کا پہلا اردو ناول نگار'' ہر لحاظ سے نہایت مدلل اور وقیع مقالہ ہے جو شادؔ کی ناول نویسی پر مقالہ نگار کے وسیع اور سنجیدہ مطالعہ اور تنقیدی و تجزیاتی محنت کا پتہ دے رہا ہے۔ یادنگاری کے انداز میں اشتیاق سعید نے ظفرؔ گورکھپوری کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، وہ بھی خاصا معلوماتی ہے۔ پریم چند پر ڈاکٹر ظہیر محمد کا مقالہ یوں اہم محسوس ہوا کہ اس سے طلبا و طالبات کو یقیناً نصابی فائدہ پہنچے گا۔ اس میں بھی شک نہیں کہ سلطان آزاد نے ''رشید النساء اور اصلاح النساء کا تجزیاتی مطالعہ'' تحقیقی مزاج کی رعایت کے ساتھ کیا ہے اور ''اردو شاعری پر کرونا کے اثرات'' کی صورت میں ڈاکٹر محمد زاہد بھی ایک نیا موضوع لائے ہیں اور مجھ جیسے قاری کو بڑے سلیقہ سے استفادہ کا موقع دے گئے ہیں۔ ''افسانے'' کے اوراق میں بانو سرتاج کی کہانی ''بدلتے رشتے'' بہت ہی اچھی کہانی ہے۔ اس کا کلائمکس چونکا تا بھی ہے اور اصل مقصد پر فن کا حریری پردہ بھی ڈالے رہتا ہے۔ بچوں کے حصہ میں عاقب محمد کی کہانی ''سقّے کی بادشاہت'' بہت اچھی لگی۔

(ڈاکٹر) ایم۔ ضیاء، نالندہ

☆ مئی ۲۰۲۴ء کا ''زبان وادب'' ڈاک کے ذریعہ پہنچا، مگر بہت دیر سے پہنچا، البتہ یہ بات دوسری ہے کہ ''بچوں کا زبان وادب'' والا حصہ کھولا اور فہرست پر نظر پڑی تو دل خوش ہوگیا، اس لئے ہی نہیں کہ اس حصہ میں آپ نے میری تحریر ''سقّے کی بادشاہت'' بہت خوبصورتی سے چھاپ دیا ہے، بلکہ اس سے کہیں زیادہ اس لئے بھی کہ روایت کے مطابق اس حصہ میں شامل سبھی چیزیں بہت کارآمد اور پسندیدہ ہیں۔ شوکت پردیسی بچوں کے لئے لکھنے والوں کی فہرست کا ایک بڑا نام ہے۔ اتفاق سے ابھی حال ہی میں ان کی بہت خوبصورت سی تصویر کے ساتھ، ان کی لائف پر چھوٹا سا مضمون پڑھنے کو ملا تھا، اُس سے معلوم ہوا کہ ان کا خاندان جونپور کا تھا، مگر ان کی پیدائش ۱۹۲۴ء میں ملیشیا میں ہوئی تھی اور بارہ سال کے ہوگئے تھے، تب ہندوستان آئے تھے، بہرحال! آپ نے ''یوم مئی'' کا خیال رکھتے ہوئے ''بچوں کا زبان وادب'' کی شروعات ان کی نظم ''مزدور'' سے کی ہے۔ بیشک ''ہیں بڑے کام کے پیارے مزدور'' اور ؎

یہ بھی سچ ہے کہ جو چاہیں دل سے
موڑ دیں وقت کے دھارے مزدور

''انسان کی عظمت'' کے عنوان سے فرزانہ اسد صاحبہ نے جو کہانی لکھی ہے، اس کہانی میں سوچ کو بدلنے اور ذہنی حوصلہ کو بچائے رکھنے کے معاملہ سے بڑا اسبق ملتا ہے۔ آدمی سیکھنا چاہے تو ساری دنیا، چرند، پرند سب اس کی مدد کے لئے گویا تیار کھڑے ہیں۔ نکہت جہاں صاحبہ نے ''کچھ باتیں سانپ کی'' بتائی ہیں جو یقیناً بڑی معلوماتی ہیں۔ گرمی کا موسم چل رہا ہے تو جناب حامد حسین ندوی کی نظم ''گرمی'' بھی بہت خوب ہے۔ اس میں شدید گرمی کے موسم کی منظر کشی بھی ہے اور یہ سبق بھی کہ جیون کی رُت چاہے جو بھی ہو، آدمی کو ہر حال میں خدا کی مرضی پر راضی رہنا چاہئے۔ اس حصہ کا اکلوتا فیـــلـــر ''آدمی کے بدن میں دو بادشاہ'' بھی بہت کارآمد ہے۔ بات تو یہی ہے کہ نیکی اپناؤ، برائی چھوڑو، مگر اس بات کو یہاں سمجھانے اور بتانے کا انداز بہت ہی انوکھا اور پیارا لگا۔ عقلمندی اسی میں ہے کہ معمول کے خلاف کوئی بات ہو تو آدمی کو سوچ سمجھ کر ہی احتیاط سے اگلا قدم اٹھائے۔ شاذیہ ترنم صاحبہ نے اپنے اسکول میں، خود اپنے ساتھ گزرا ہوا، ٹفن باکس کا جو

قصہ لکھا ہے، وہ سچ مچ یہی ذہن دے رہا ہے کہ آج کے زمانے میں خاص طور سے احتیاط برتنا چاہئے۔ آخر میں اپنی کاوش 'سقّے کی بادشاہت'' کی اشاعت پر آپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے خدا حافظ!

عاقب محمد، لکشمی نگر، نئی دہلی

☆ 'زبان وادب'' مئی ۲۰۲۴ء ملا۔ اس مرتبہ بچوں کے حصے میں آپ نے تین تین کہانیاں چھاپا ہے اور خیر سے یہ تینوں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں، بہت دلچسپ اور بہت ہی فائدہ مند۔ آدمی اپنی ناقدری سے بددل اور مایوس ہوا ہی کرتا ہے، یہ تو عام فطرت ہے، لیکن وہ ذرا سا اپنی سوچ بدل لے اور پنڈت جی کی طرح لومڑی اور لومڑی کے ساتھ چڑیا اور خرگوش کی باتوں پر دھیان دے دے تو وہ ایک بڑا پیغام پا سکتا ہے، اس کی مایوسی دور ہوسکتی ہے اور اسے بڑی عزت مل سکتی ہے۔ زندگی اور زمانے کی سچائی اور قدرت کے نظام پر غور کر کے، نئے حوصلے سے آگے بڑھنے میں ہی ''انسان کی عظمت'' کا وہ راز چھپا ہوتا ہے، جسے فرزانہ اسد نے اپنی کہانی میں دکھانا چاہا ہے۔ اس شمارے میں عاقب محمد کی کہانی ''سقّے کی بادشاہت'' اگرچہ اصل میں ایک تاریخی واقعہ پر اپنی بنیاد رکھتی ہے، مگر کہانی کار نے جس انداز سے اس کی بنت کی ہے، وہ بہت کامیاب انداز ہے، اس کے لئے انہیں مبارکباد! اس کہانی میں کچھ تہذیب وآداب کی باتیں مثلاً کھانے کے دوران خاموش رہنے کی بات بھی یاد دلا دی گئی ہے، ضروری تاریخی معلومات بھی کہانی کار نے، دادی ماں کی زبانی مہیا کرا دیا ہے، کچھ اردو مترادفات اور محاورے کی بات بھی آ گئی ہے اور یہ ذہن بھی صاف کر دیا گیا ہے کہ کامیابی اتفاقاً اور صرف تقدیر سے نہیں ملتی ہے، بلکہ اس کے پیچھے آدمی کی سوچ، اس کے انسانی رویے اور اس کے جذبہ قربانی کا بھی عمل دخل رہتا ہے۔ فرزی کے یہ کہنے پر کہ ''وہ بیچارا تو بہت لکی نکلا دادی'' دادی اماں کی زبانی، اس کہانی کے اسباق جس ڈھنگ سے سمجھائے گئے ہیں اور ہمایوں بادشاہ اور سقّے کے کردار کی خوبیاں جس طرح بتائی گئی ہیں، وہ اس تاریخی کہانی کو اخلاقی اور تربیتی دائرے میں بھی کامیابی کے ساتھ لے آتی ہے، پھر نظام سقا کے مزار کی تصویر نے کہانی میں اور بھی تاریخی وزن لا دیا ہے۔ ''انسان کی عظمت'' اور 'سقّے کی بادشاہت'' کے ساتھ اس شمارے کی تیسری کہانی بھی، جسے شاذیہ ترنم نے ''ایک واقعہ، ایک سبق'' کا عنوان دیا ہے، بروقت سمجھداری اور احتیاط سے کام لینے کا سندیسا دیتی ہے۔ کہنے کو یہ ایک چھوٹی سی کہانی ہے، مگر بہت خاص ہے اور بہت ہی فائدہ دینے والی، پھر یہ کہ اس میں آپ بیتی کا رنگ بھی ہے۔ فیلر ''آدمی کے بدن میں دو بادشاہ'' بھی بہت اچھا ہے اور پھر اس شمارے کی دونوں نظموں یعنی ''مزدور'' (شوکت پردیسی) اور ''گرمی'' (حامد حسین ندوی) کا انتخاب بھی مہینے اور موسم کے لحاظ سے بہت برجستہ ہے۔ ایک نظم مزدور کی عظمت دکھا رہی ہے، اس کی طاقت بتا رہی ہے اور اس کی عزت اور اس سے پیار کا پیام دے رہی ہے تو دوسری نظم ''آدمی، چرند وپرند، بچے، بڑے سبھوں کی موسم گرما میں پریشانی کے مناظر دکھا کر، ہمیں یہ سکھا رہی ہے کہ بہر حال ہمیں اللہ جس حال میں رکھے، اس حال میں اس کی مرضی پر راضی اور خوش رہنا چاہئے۔ سانپ کے تعلق سے جنابہ نکہت جہاں کا مضمون بھی اچھا ہے۔

مریم فاروق، داناپور، پٹنہ

☆ ''زبان وادب'' پابندئ وقت سے مل رہا ہے، ہر شمارہ پچھلے شمارے سے بڑھ کر دیدہ زیب اور پرکشش ہوا کرتا ہے۔ مضامین، افسانے اور شعری تخلیقات اپنی اپنی جگہ معیاری، دلچسپ اور پسندیدہ ہوا کرتی ہیں۔ 'بچوں کا زبان وادب'' دوسرے رسالوں کے لئے ''تقلید عمل'' کی جانب اشارہ کہا جا سکتا ہے۔

محسن باعشن حسرت، کلکتہ

خریداروں کے لئے ضروری اطلاع

☆ محکمہ ڈاک نے انڈر پوسٹنگ سرٹیفکیٹ سسٹم ختم کر دیا ہے، لہٰذا خریدار حضرات کو اب سادہ ڈاک سے رسالہ بھیجا جاتا ہے۔ رسالہ کی گمشدگی کے لئے ادارہ پر کسی طرح کی کوئی ذمہ داری اور باز پرس نہیں ہوگی۔

☆ اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ (سرکولیشن انچارج)

بچوں کا

زبان وادب

☆	دعا	امیر احمد خسرؔو	۷۴
☆	مٹی کا دیا	ماخوذ	۷۴
☆	لالچ کا پھل	تنویر اختر رومانی	۷۵
☆	زبان کی الٹی چال	توحید اختر	۷۶
☆	سندیسا کھوپڑی کا	محمد ریحان	۷۷
☆	قربانی اور کامرانی کا رشتہ ومرتبہ	پرویز اختر	۷۹

امیر احمد خسروؔ

دعا

خداوند عالم یہی اک دعا ہے
یہی دل میں ہے اک تمنا خدایا
اٹھا دے ، یہ غفلت کا پردہ اٹھا دے
خوشی کا الٰہی زمانہ وہ آئے
نہ کچھ دشمنی ہو ، نہ خوں ریزیاں ہوں
خلوص و محبت کا چمکے ستارا
دلوں میں نیا حوصلہ مسکرائے
ستائے نہ افلاس و غربت کسی کو
سب انسان آپس میں ہوں بھائی بھائی
خوشی کا زمانے میں ہو بول بالا
خداوند عالم یہی اک دعا ہے

یہی آرزو ہے ، یہی التجا ہے
محبت کی دنیا ہو ، دنیا خدایا
ہر انساں کو دنیا میں جینا سکھا دے
جو دنیا کو رہنے کے قابل بنا دے
نہ ہو ظلم کوئی ، نہ چنگیزیاں ہوں
بنے زندگی ، زندگی کا سہارا
خوشی کا ترانہ ہر اک لب پہ آئے
ہو نہ بے جا غرورِ امارت کسی کو
یہ نفرت مٹے اور مٹے ہر برائی
محبت کا ہو جائے ہر سو اُجالا
یہی آرزو ہے ، یہی التجا ہے

(مجموعہ کلام ''اکھوا'' مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۷۹ء ۳۴ و ص ۳۵ سے ماخوذ)

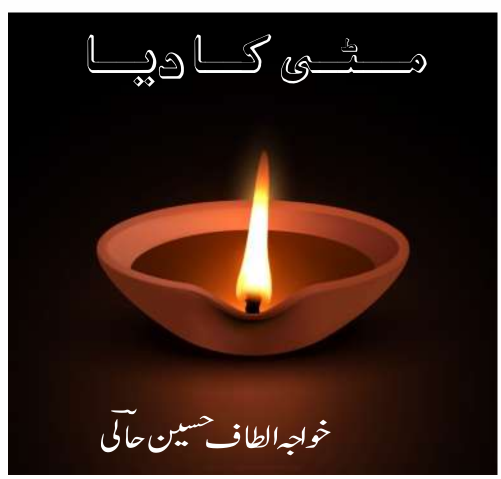

جھٹپٹے کے وقت گھر سے ایک مٹی کا دیا
ایک بڑھیا نے سر رَہ لا کے روشن کر دیا
تا کہ رَہ گیر اور پردیسی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں
راہ سے آساں گزر جائے ہر ایک چھوٹا بڑا
یہ دیا بہتر ہے اُن جھاڑوں سے اور اُس فانوس سے
روشنی محلوں کے اندر ہی رہی جن کی سدا
گر نکل کر اک ذرا محلوں سے باہر دیکھئے
ہے اندھیرا گھپ دَر و دیوار پر چھایا ہوا

تنویر اختر رومانی
59, Chuna Shah Colony, P.o. Maango, Jamshedpur - 831012 (Mob. 7004384853)

لالچ کا پھل

الباب کی عمر یہی کوئی نو دس سال کی تھی۔ اس کی ایک خراب عادت یہ تھی کہ راستہ چلتے ہوئے اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتا رہتا کہ شاید کوئی قیمتی چیز یا کوئی نوٹ پڑا ہوا مل جائے۔

ایک دن، شام کے وقت اس کی امی نے پچاس روپے دے کر سبزی لانے کو بھیجا۔ عادت کے مطابق اس دن بھی وہ ادھر اُدھر سڑک پر دیکھتا جا رہا تھا۔ اتفاق کی بات کہ اچانک اسے سڑک کے کنارے پانچ سو کا ایک نوٹ پڑا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے لپک کر نوٹ اٹھالیا اور جلدی سے پینٹ کی اندر والی جیب میں رکھ لیا، پھر چاروں طرف دیکھنے لگا کہ کسی نے اسے نوٹ اٹھاتے ہوئے دیکھا تو نہیں۔

اس نے دیکھا کہ اس سے عمر میں تھوڑا بڑا ایک لڑکا دوڑتا ہوا اسی کی طرف آ رہا ہے۔ الباب نے سوچا، شاید نوٹ اسی لڑکے کا ہے۔ وہ گھبرا گیا۔ اب کیا کرنا چاہئے؟ لڑکا آ کر مار پیٹ کر اپنا روپیہ چھین لے گا۔ یہ سوچ کر وہ وہاں سے بھاگا۔ اب آگے آگے الباب اور پیچھے پیچھے وہ لڑکا۔ الباب بے تحاشہ بھاگ رہا تھا اور بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ بھی لیتا تھا کہ پیچھا کرنے والا لڑکا اس سے کتنی دور ہے۔

اب وہ بازار کے قریب پہنچنے ہی والا تھا، لیکن جیسے ہی ایک بار پھر پیچھے مڑ کر دیکھنے لگا، تبھی سامنے سے آتی ہوئی سائیکل سے بری طرح ٹکرا گیا اور زمین پر گر گیا۔ سائیکل سوار بکتا جھکتا آگے بڑھتا چلا گیا۔ الباب نے دیکھا کہ وہ لڑکا اب بھی دوڑا آ رہا ہے۔ وہ بہت پریشان ہوا کہ اب کیا کرے؟ اس نے اٹھنے کی کوشش کی، مگر پیر میں ایسی چوٹ لگی تھی کہ وہ اٹھ نہیں سکا۔ پیچھے دوڑنے والا لڑکا اس کے نزدیک پہنچنے ہی والا تھا، لیکن یہ کیا؟ وہ لڑکا تو دوسری طرف مڑ گیا۔

''اوہ......!'' الباب کے منھ سے نکلا۔ وہ لڑکا شاید کسی اور کام کے لئے دوڑا آ رہا تھا۔ وہ بیکار ہی یہاں تک بھاگا چلا آیا۔ اسے فضول ہی یہ شک ہو گیا تھا کہ کہیں پایا ہوا روپیہ اسی کا ہوگا، تب ہی وہ دوڑا آ رہا ہے۔ اسے اب بہت افسوس ہو رہا تھا۔ چوٹ کی تکلیف کم ہوئی تو وہ ہمت کر کے اٹھا اور تھوڑی دور چل کر سبزی کی دکان پر پہنچا اور سبزی خرید کر، شرٹ کی اوپری جیب میں رکھا، ماں کا دیا ہوا پچاس کا نوٹ نکالنے کے لئے ہاتھ ڈالا تو وہاں نوٹ نہیں تھا۔ بھاگ دوڑ میں نوٹ کہیں گر گیا تھا۔ اب تو اسے اور افسوس ہونے لگا۔

شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ اس نے سوچا، چلو جو نوٹ سڑک پر ملا ہے اسی سے سبزی کے دام چکا دے۔ اس نے پینٹ کی اندرونی جیب سے نوٹ نکال کر سبزی والے کو دیا۔ سبزی والے نے نوٹ لے کر اس کا جائزہ لیا اور الباب کو غصہ بھری نگاہوں سے دیکھتا ہوا بولا:

''اتنی چھوٹی عمر میں یہ چالبازی؟......بچوں کے کھیلنے والا نوٹ دے کر مجھے ٹھگنے چلا ہے......چل بھاگ یہاں سے۔'' اور اس نے سبزی کا پالی تھین الباب سے چھین لیا۔

الباب کو کاٹو تو خون نہیں۔ اسے خود پر بڑا غصہ آیا کہ لالچ کی وجہ سے اس کو چوٹ بھی لگی اور شرمندہ بھی ہونا پڑا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ اب وہ کبھی لالچ نہیں کرے گا۔ ❁❁❁

- بزرگی عمر سے نہیں بلکہ عقل سے ہوتی ہے اور مالداری مال سے نہیں بلکہ دل یعنی سخاوت سے ہوا کرتی ہے
- کوئی مشکل ایسی نہیں جو آسان نہ ہو، شرط یہ ہے کہ آدمی مشکل کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے اور پریشان نہ ہو
- جواں مرد وہی ہے جو دیوار پر لکھی ہوئی نصیحت بھی اپنے ذہن میں محفوظ کر لے اور اُس پر ہمیشہ عمل کرے
- بے ہنر کے سو سال سے باہنر کا ایک سال کہیں زیادہ بہتر ہے
- اگر تم سچائی پر ہو تو کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں

توحید اختر
Baria Road, Muzaffarpur - 842003

زبان کی الٹی چال

پیارے بچو! اس پوری دنیا کو عالم اکبر، کہا جاتا ہے اور ہمارا جسم اس عالم اکبر یعنی بڑی دنیا کے مقابلے میں عالم اصغر، یعنی ایک چھوٹی سی دنیا کہلاتا ہے، مگر اسے معمولی سمجھنے کی غلطی کرنے والے ہمیشہ ہمیش کے لئے گھاٹے میں چلے جاتے ہیں۔ اللہ نے ہمیں طرح طرح کے اعضاو جوارح سے نوازا ہے، لیکن جب ہم ان کی حفاظت اور صحت پر دھیان نہیں دیتے تو ہمیں نہ جانے کیسی کیسی بیماری، پریشانی اور یہاں تک کہ ہمیشہ کی معذوری کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مگر یہ تصویر کا ایک رُخ ہے، تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ جب ہم اپنے ہاتھ، پیر، چہرے، آنکھ، ناک، کان، دل و دماغ اور زبان سے صحیح مصرف نہیں لیتے ہیں اور انہیں الٹی چال چلنے پر مجبور رکھتے ہیں تو دنیا اور آخرت کی انگنت آفتیں ہمیں گھیر لیتی ہیں۔

ہاتھ، پیر کی الٹی چال یہ ہے کہ ہم اس سے کسی کو تکلیف پہنچائیں، کوئی برا کام کریں یا کسی بری جگہ جائیں۔ آنکھ اور کان کی الٹی چال یہ ہے کہ ہم بری اور خراب چیزیں دیکھیں اور بری باتیں سنیں۔ چہرے اور ناک کی الٹی چال یہ ہے کہ کسی کو دیکھ کر بلاوجہ ہم خود اپنے چہرے کا زاویہ بگاڑ لیں، بلاوجہ ناک منھ سکوڑ لیں یا بلاوجہ کسی کا کپڑا یا بدن سونگھ کر اُسے بدبودار کہیں اور ناک بند کرنے لگیں یا پھر خوشبو کی بجائے، بدبو والی جگہ پر جائیں یا گندی مہک والی چیز اِدھر اُدھر ڈال دیں جو اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی انتہائی تکلیف دہ ہو۔ دل دماغ کی الٹی چال یہ ہے کہ ہم کسی کے حق میں برا سوچیں اور حسد میں پڑے رہیں۔ اسی طرح زبان کی الٹی چال یہ ہے کہ ہم اس سے اللہ کو یاد کرنے اور اچھی بات بولنے کی بجائے کسی کی ہنسی اُڑانے لگیں، کسی سے گندے مذاق کرنے لگیں اور کسی کو طعنہ دینے لگیں۔

بہت سارے بڑوں اور بچوں کو بات بات پر ٹھٹھا کرنے کی عادت ہوتی ہے اور انہیں یاد نہیں رہتا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس سے منع کیا ہے اور یہ دھیان بھی دلایا ہے کہ ظاہری احوال اور اعمال کو دیکھ کر تم جس شخص کو مذاق کا نشانہ نہ بناؤ، کیا معلوم کہ وہ اللہ کے نزدیک تم سے بہتر ہو۔

ہم آپس میں ایک دوسرے کے عیب نکالتے رہتے اور چڑانے کے لئے برے برے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ اصل میں ایک ایسا ظلم ہے جو زبان کی الٹی چال سے جڑا ہوا ہے، کسی کے پوشیدہ عیب پر اس کو عار دلانا، اس کو ڈھونڈنا اور دوسروں کو بتانا یقیناً زبان کا بڑا گناہ ہے۔ ہم کسی کو برے القاب سے پکاریں یا کسی کے پوشیدہ حالات کی ٹوہ میں لگ جائیں اور اس کی تشہیر کریں تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ ہم اپنے دل و دماغ، آنکھ کان اور خصوصاً زبان کو الٹی چال چلنے پر مجبور کر کے گناہ مول لے رہے ہیں اور سماج میں بھی اپنے لئے کسی خطرے کو دعوت دے رہے ہیں۔

غیبت، بہتان اور عیب کی جستجو، زبان کو گندگی سے آلودہ کرنے ہی کا نام ہے اور غیبت تو اتنی بری اور گھناؤنی چیز ہے کہ اُسے قرآن پاک میں اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے برابر کہا گیا ہے۔ غیبت، چغل خوری ہے، یعنی پیٹھ پیچھے کسی کی برائی، جب کہ منصوبہ بنا کر کسی کے سر کوئی جھوٹا الزام تھوپنا اور اسے بدنام کرنا بہتان کہلاتا ہے۔ قرآن پاک میں اس کو ''افک'' کہا گیا ہے، بہتان تراشی، چغل خوری، غیبت، حسد اور جھوٹ یہ سب اصل میں زبان کی الٹی چال کے نام ہیں، پھر ایک عمل وہ بھی ہے جس کو منافقت یا دورخا پن کہا جاتا ہے اور اسے ہی عام زبان میں دوغلہ پن بھی کہتے ہیں، یعنی ایک گروپ سے اس کی خواہش کے مطابق باتیں کرنا اور پھر دوسرے گروہ کے سامنے اس کے جیسی باتیں کرنا۔ اس طرح زبان کو الٹی چال چلانے والے وہ

(بقیہ ص ۸۷ پر)

محمد ریحان

Sabzibagh, Patna- 800004

سندیسا کھوپڑی کا

پنڈت جی، اپنے معمول کے مطابق آج بھی صبح سویرے گنگا اشنان اور پھر مندر میں پوجا پاٹ کے بعد گھر لوٹنا ہی چاہتے تھے کہ اچانک اُن کی نظر ندی کے کنارے پڑی ہوئی ایک گول سی چیز پر پڑی، ذرا نزدیک جا کر دیکھا تو اُس بھدی سی گول چیز پر کچھ لکھا ہوا بھی تھا۔ انہوں نے چشمہ کی کمانی ٹھیک کی اور غور سے پڑھا، پہلے تو انہیں ہنسی آئی کہ پتہ نہیں یہ کس مسخرے کا کام ہے، پھرانہیں نہ جانے کیا خیال آیا کہ اُس چیز کو احتیاط سے اٹھایا اور اپنے بڑے سے لال رومال میں لپیٹ کر گھر لے آئے اور کوٹھری کے مچان پر رکھتے ہوئے پنڈتائن سے بولے:

''اس میں بڑی مولک وستو (قیمتی چیز) ہے۔ اسے کوئی ہاتھ نہیں لگائے اور خبردار! نہ ہی کوئی اسے کھول کر دیکھے۔''

پنڈت جی کی بات سن کر پنڈتائن نے مسکرا دیا۔ ان کی اکلوتی بیٹی ساوتری بھی وہیں پر کھڑی تھی، اس نے غور سے ماں کو دیکھا اور پھر جیسے لاج سے اپنا سر جھکا لیا۔ بات یہ تھی کہ اس کی ڈولی اٹھنے میں بس مہینہ بھر ہی رہ گیا تھا، اس نے سوچا، ہوسکتا ہے اس لال پوٹلی میں ڈھیر سارا گہنا پاتی ہو۔

بات آئی گئی ہوگئی، مگر جب بھی اس پوٹلی پر نظر جاتی، ماں بیٹی دونوں سوچنے لگتیں، پتہ نہیں اس پوٹلی میں کیا ہے؟ پہلے تو انہوں نے سوچا کسی دن پنڈت جی خود ہی بتائیں گے اور اسے کھول کر دکھائیں گے، مگر جب کئی دن ہوگئے تو ان سے رہا نہیں گیا۔ وہ موقع کی تاک میں تھیں ہی اور اتفاق کہ ہفتہ دن ہوتے ہوتے ان کو یہ موقع مل ہی گیا۔

''ارے ساوتری! اُتار تو وہ پوٹلی، ذرا دیکھیں، تیرے بابو جی کیا مولک وستو اس میں رکھ لائے ہیں۔''

پنڈتائن نے اُس دن صبح صبح بیٹی سے کہا، بات یہ تھی کہ پنڈت جی صبح اشنان کو گئے تھے تو کہہ کر گئے تھے کہ ان کو لوٹنے میں آج تھوڑی سی دیر ہوگی۔

ماں کی بات سن کر ساوتری ذرا ٹھٹکی۔

''ارے دیکھتی کیا ہے؟ تیری کاٹھی ذرا لمبی ہے، اس لئے کہہ رہے ہیں......نہیں تو ہم خود ہی اتار لیتے ہیں، تجھے تو ہر بات میں ڈر لگتا ہے اور بیاہ کے دن کیا آرہے ہیں، بس ہر بات میں لاج کے مارے دہری ہوئی جاتی ہے۔''

اور پھر وہ پوٹلی مچان سے اتار لی گئی۔

پنڈتائن نے بڑی احتیاط سے کھولا۔ ساوتری ذرا ہٹ کے کھڑی تھی، پتہ نہیں اُسے لاج لگ رہی تھی یا کچھ ڈر لگ رہا تھا۔

''ارے یہ کیا...... یہ تو کوئی کھوپڑی ہے...... تیرے بابو جی بھی اب سٹھیا چلے ہیں۔ مردے کی ہڈی گھر سے باہر پھینکی جاتی ہے اور پتہ نہیں وہ کس شمشان گھاٹ سے یہ اٹھا لائے ہیں...... مگر بیٹی، ذرا ادھر تو آ، دیکھ اس پر کچھ لکھا ہوا ہے، مٹا مٹا سا۔ میری آنکھ تو اب دھندلی ہوگئی ہے۔ اسے پڑھ کر بتا...... کوئی اشلوک ہے کیا؟''

''نہیں ماں! اس پر تو بس اتنا ہی لکھا ہے کہ:

''...... اور جو بچا ہے وہ بھی پورا ہوگا۔''

ساوتری نے اٹک اٹک کر مشکل سے پڑھا۔

''ارے تو پھر دیکھتی کیا ہے؟ جا، وہ موسل اُٹھا لا...... اچھا ٹھہر...... میں ہی لاتی ہوں...... تیرے بابو جی......'' اور پھر وہ کھوپڑی موسل سے چور چور کر دی گئی۔

''ارے ذرا ہٹ! اس کو سنڈاس میں ڈال آئیں...... اور جا ......کوٹھری کو لیپنے کا سامان بھی اٹھا لا۔''

وہ مولک وستو، اپنے انجام کو پہنچ چکی تھی۔ پنڈت جی دن چڑھے گھر آئے، مچان پر پوٹلی کی جگہ خالی پایا اور کوٹھری کو تازہ تازہ لیپا ہوا

دیکھا تو پوچھنے لگے:

''یہ سب کیا......؟''

''ارے ہم نے آپ کی اس مولک وستو کو موسل سے کوٹ کر سنڈاس میں ڈال دیا، گئی نرک میں ...... جو وستو گھر سے باہر پھینکی جاتی ہے۔ آپ بھی عجیب آدمی ہو، کہاں سے اُٹھا لائے تھے اور مچان چڑھا کر رکھ دیا۔ اس پر لکھا تھا 'جو بچا ہے وہ بھی پورا ہوگا' ہم نے پورا کر دیا......''

پنڈتائن کا غصہ دیکھنے کا تھا، جب وہ چپ ہوئیں تو پنڈت جی بڑے گمبھیرتا سے بولے:

''ہاں! جو بچا تھا، وہ پورا ہوا۔ اُسی سندیسا سے تو وہ کھوپڑی مولک ہوگئی تھی۔ ہم نے بھی پہلے اس کو کسی منچلے کی شرارت ہی سمجھا تھا، پھر سوچا گھر لے چلیں، دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔'' پھر وہ ساوتری کی طرف مڑے اور کہنے لگے:

''بیٹی! تم تو اپنی ماں سے زیادہ اور نئے زمانے کی پڑھی لکھی ہو، نئے گھر جاؤ گی، یاد رکھنا کرم کا پھل مل کر رہتا ہے اور یہیں دیکھنے کو مل جاتا ہے اور کرم برا ہو تو کیا ندی کنارے سے اور کیا اونچے مچان سے ہر حال میں سنڈاس یعنی نرک تک لے ہی جاتا ہے۔ بیٹی! ہر آدمی کو اپنے کرم کا بدلہ ملتا ہے، جو ہوا، جو دیکھا اس سے عبرت لو، جیون سکھی رہے گا، اپنے میکے، سسرال، اپنی پڑھائی اور کسی بات پر کبھی گھمنڈ مت کرنا، گھمنڈ چور چور ہو جاتا ہے۔ ❁❁

زبان کی الٹی چال (ص ۷۶ سے آگے)

بد دیانت لوگ ہوتے ہیں جن کو حدیث میں ''دو چہرے والے'' کہا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ایسے بد دیانت لوگوں کے منھ میں قیامت کے دن آگ کی دو زبانیں ہوں گی۔

سچائی اور وعدے کی پابندی کو بعض عالموں نے دین کا ستون کہا ہے، جھوٹ اور وعدہ خلافی وہ گناہ ہے جو زبان کے ذریعہ سرزد ہوتا ہے اور زبان کو یوں الٹی چال چلانے والے دنیا میں بھی رسوا اور بے اعتبار ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی ان کے لئے عذاب ہے۔

بڑے ہی کیا، کم عمر بچے بھی اکثر آپس میں گندی گندی باتیں کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو مذاق میں گالی گلوج کے الفاظ سے پکارتے رہتے ہیں، جھوٹی باتیں سناتے ہیں، وعدہ کر کے مکر جاتے ہیں۔ یہ سب زبان کو گویا جان بوجھ کر الٹی چال چلنے کی عادت دلانا ہے۔ اکثر یہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے اور آدمی اپنی ناسمجھی سے زبان کو الٹی چال چلنے کا موقع دیتا ہے اور خوش ہوتا ہے، جب کہ یہ سب شیطان کے ہتھکنڈے ہیں اور ہم سب جانتے ہیں، اللہ کی کتاب نے بتا دیا ہے کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔ اللہ نے ہمیں اعضاو جوارح کے ساتھ ان کے استعمال کا اختیار بھی دیا ہے تو ہماری کامیابی ان کے اچھے استعمال اور انہیں سیدھی چال پر رکھنے میں ہی ہے۔ ❁❁

میٹھے بچن سنائے کے۔۔۔

پیارے بچو! تم میں سے بھلا کس نے ''کوا'' نہیں دیکھا ہوگا۔ وہی پرندہ جس کا رنگ کالا ہوتا ہے اور جو ہر وقت ''کائیں کائیں'' کرتا رہتا ہے۔ تم نے یہ بھی ضرور دیکھا ہوگا کہ اس کی چونچ کیسی نوکیلی اور کتنی تیز ہوتی ہے۔ انتہائی کالا کوا جس کا رنگ بہت چمکتا ہے ''کاک بھجنگ'' کہلاتا ہے۔ کوے کی مادہ کون؟ اس سوال پر بڑا اختلاف ہے۔ کوئی کہتا ہے کوے کی مادہ کوی ہوتی ہے، کوئی کہتا ہے کوئل، کوئی کہتا ہے مینا اور کوئی کہتا ہے چیل۔ بہر حال اس بحث کو چھوڑو، جہاں تک کوے کے کھانے کی بات ہے، وہ کیڑے مکوڑے، سڑی گلی لاش اور ایسی ہی دوسری گندی چیزیں کھایا کرتا ہے اور کہا جاتا ہے جس کی جیسی غذا، ویسی اس کی ذہنیت۔ اپنی غذا کی نسبت سے کوے کی ذہنیت بھی گندی اور پست ہوتی ہے۔ کوے کے مقابلے میں ہنس کو دیکھو۔ ہنس کا رنگ بالکل سفید ہوتا ہے اور یہ سچے موتی چگتے ہیں تو پھر ان کی ذہنیت بھی صاف ستھری، اعلیٰ اور نہایت شریفانہ ہوتی ہے اور رہ گئی بات کوے اور کوئل کی تو ہندی کے ایک کوی نے کتنی اچھی بات کہی ہے کہ ؎

کوا کاکو دھن دھرے نہ کوئل کاکو دیت | میٹھے بچن سنائے کے جگ اپنو کر لیت

مطلب یہ ہے کہ نہ تو کوا کسی کی دولت چھینتا ہے، نہ ہی کوئل کسی کو کچھ دیتی ہے، مگر وہ میٹھے بچن سنا کر دنیا کو اپنا بنا لیتی ہے۔ (ماخوذ)

پرویز اختر
Pathar Ki Masjid, Patna - 800006

قربانی اور کامرانی کا رشتہ و مرتبہ

پیارے بچو! دنیا جانتی ہے کہ صبر و شکر اور ایثار و قربانی کتنی عظیم صفتیں ہیں اور قاعدہ یہ ہے کہ کوئی صفت جتنی عظیم ہوتی ہے، اس کے حوالے سے امتحان و آزمائش کی گھڑی اتنی ہی کٹھن اور دشوار ہوا کرتی ہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی اٹل ہے کہ جب اللہ کا کوئی بندہ اُن آزمائشوں سے کامیابی کے ساتھ گزر جاتا ہے تو پھر وہ ''اولوالعزم'' کا لقب پالیتا ہے اور اپنے رب کا محبوب و مقرب بندہ بن جاتا ہے۔

انبیائے کرام کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ وہ اپنے اپنے وقت میں، بڑے بڑے امتحانوں میں ڈالے گئے، لیکن ان کے پائے استقلال میں کبھی کوئی لغزش نہیں آئی، یہاں تک کہ اُن کی ایک ایک ادا، زندگی اور زمانے کے لئے مثال بن گئی۔ حضرت ایوب علیہ السلام کا صبر ہو یا حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کی قربانیاں، بہرحال آج بھی یادگار ہیں اور رہتی دنیا تک یادگار رہیں گی۔ خود ہمارے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بھی طرح طرح کی آزمائشوں سے گزری اور آپ پیغمبرانہ شان کے ساتھ ان میں کامیاب ہوئے۔

عزیز بچو! انسان اس دنیا میں آیا ہے تو وہ اپنی دائمی فطرت لے کر آیا ہے۔ مال و دولت، بیوی بچے، اپنا گھر، اپنا وطن اور سب سے بڑھ کر اپنی جان اور اپنی اولاد سبھوں کو عزیز ہوتی ہے اور جب ان کی قربانی دینے کا وقت آتا ہے تو بڑے بڑے سورماؤں کے تن بدن کانپ جاتے ہیں اور ناکامی ان کا مقدر ہو جاتی ہے، لیکن اللہ کے نیک بندے اور خصوصاً اولوالعزم پیغمبروں کی شان بڑی ہی نرالی ہے۔ وہ بڑی بڑی آزمائشوں سے ہنستے کھیلتے گزر جاتے ہیں، یہاں تک کہ ان کے جذبہ ایثار و فدویت کی بدولت انہیں خلت یعنی اللہ سے دوستی کا لباس ملتا ہے اور خلیل اللہ کا لقب، یاد رکھنے کی بات ہے کہ خلیل دوست کو کہتے ہیں۔

جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعات مشہور و معروف ہیں۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک بار، ایک فرشتہ نہایت خوبصورت انسان کی شکل میں، بظاہر ایک نووارد مسافر بن کر ان کے پاس آیا۔ اس وقت وہ اپنے مویشیوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ آنے والے نے انہیں حمد الٰہی کے کلمات سنائے تو وہ پھڑک اٹھے، فرمایا:

دل کی لگن اور اس کا ثمرہ

پیارے بچو! ہم سب جانتے ہیں کہ اس دنیا میں ہمیں بیکار اور بے مقصد نہیں بھیجا گیا ہے۔ گویا ہماری زندگی اور ہمارے عمل کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور جب ''کام'' یعنی عمل ہماری ذمہ داری ٹھہری تو پھر یہ بھی ضروری ہے کہ ہم جو کام کریں، دل لگا کر کریں۔ اسی کو ''دل کی لگن'' کہا جاتا ہے۔ اس سے مراد اصل میں دل کا شوق یا دلی خواہش ہے۔ جب کسی مقصد یا کسی مشن کے لئے انسان کے دل میں لگن پیدا ہو جاتی ہے تو پھر اس کی طلب دل میں اس طرح رچ بس جاتی ہے کہ یہ اس کی عادت ثانیہ بن جاتی ہے، یعنی ہر وقت اس مقصد کا خیال حاوی رہتا ہے اور اُسے پانے کی راہ میں جو پریشانیاں آتی ہیں، وہ بھی آسان اور مزے دار معلوم ہوتی ہیں۔ دل کی لگن اصل میں ایک بڑی طاقت کا نام ہے اور اسے پانے کے لئے بڑے غور و فکر، جد و جہد، صبر و استقلال اور یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے۔ دل کی لگن سے ایک انہماک آتا ہے مثلاً اس طرح دل لگا کر امتحان کی تیاری کرنے والے اکثر کھانا پینا بھی بھول جاتے ہیں۔ ضروری فرائض ادا کرتے ہوئے اپنے کسی مخصوص اور بلند مقصد کام میں جب تن من دھن سے آدمی لگ جاتا ہے تو پھر اس کے لئے کامیابیوں کی بلند ترین چوٹیوں پر پہنچنا ناممکن نہیں ہوتا۔ امتحانوں کی تیاری میں جب ذہنی یکسوئی، دلی لگن اور ٹھوس ارادے کے ساتھ، کتابوں کا مطالعہ ہوتا ہے تو اس کے پھل پا کر خود طالب علم بھی حیران رہ جاتے ہیں۔ (ماخوذ)

''ایک باراور سناؤ''

آنے والے نے پوچھا: ''دوبارہ سنانے پر آپ کیا دیں گے؟''

فرمایا: ''یہ مویشیوں کے بڑے ریوڑ دیکھ رہے ہو، ان کا نصف لے لو اور ایک بار وہی حمد الٰہی سناؤ۔''

اس شخص نے دوبارہ وہ حمد سنادی۔ آپ نے فرمایا:

''ایک باراور سناؤ''

پوچھا: ''اب کیا دیں گے؟''

فرمایا ''جو نصف حصہ بچا ہے وہ بھی لے لو''

اس نے پھر حمد الٰہی سنایا۔ آپ نے کہا:

''ایک باراور......''

پوچھا: ''اب کیا دیں گے؟ سارا مال ومویشی تو دے چکے۔''

فرمایا: ''میں اپنے آپ کو تمہاری غلامی میں دے دوں گا۔''

اس شخص نے حمد سنائی اور کہا کہ یہ بس ایک امتحان تھا، آپ سرخرو ہوئے، مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں، میں تو اصل میں اللہ کا بھیجا ہوا ایک فرشتہ ہوں۔

یہ مال ومتاع کے ایثار کی مثال تھی جو اللہ کے خلیل نے پیش کردی تھی اور پھر وہ واقعات تو مشہور زمانہ ہیں کہ آپ نے اپنے اہل وعیال کو حکم الٰہی پر چٹیل بے آب وگیاہ میدان میں لے جا کر چھوڑ دیا، یہ گویا وطن اور گھر بار کی قربانی تھی، پھر جان کی قربانی کا وقت آیا، آپ آتش نمرود میں ڈالے گئے اور وہ آگ گلزار بن گئی، اسی طرح اللہ کے حکم پر اپنے بڑھاپے کی اولاد حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے گلے پر آپ نے چھری پھیردی اور ان کے بدلے میں جنت سے دنبہ بھیجا گیا۔ گویا وہ ساری چیزیں جو انسان کے لئے متاعِ عزیز کہلاتی ہیں، آپ نے راہِ خدا میں قربان کردیں اور بڑے سارے امتحان میں سرخرو ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ خدائے پاک نے آپ کے اس عمل کو قیامت تک کے لئے عبادت میں داخل کردیا۔

حج کرنے والے کعبہ کا طواف کرتے ہیں یہ تعمیر ابراہیمی ہے، صفا اور مروا کی پہاڑیوں پر دوڑتے ہیں اور شیطان کو کنکریاں مارنے کا عمل پورا کرتے ہیں۔ یہ سب حضرت ابراہیم واسمٰعیل اور حضرت ہاجرہ کے عمل کی یادگاریں ہیں اور رہا عیدالاضحیٰ میں جانوروں کا ذبیحہ تو اس کے بارے میں اللہ کے نبی نے بتا ہی دیا ہے کہ یہ تمہارے باپ حضرت ابراہیم کی سنت ہے۔

جانوروں کی قربانی اصل میں ایک علامت ہے جس سے ایثار و قربانی کا جذبہ سلامت رکھنے کا پیغام ملتا ہے۔ قربانی اور کامرانی کا رشتہ اٹوٹ، ازلی اور ابدی ہے۔ بڑے ہوں یا چھوٹے، زندگی اور زمانے میں وقت عزیز، پیہم خواہشات وجذبات اور طاقت وتوانائی کی قربانی سے ہی اپنی دنیا اور آخرت بنانے میں کامراں ہوتے ہیں۔

❀❀❀

کار آمد اشعار

سیمابؔ کے رسالہ ''انمول موتی'' سے ماخوذ

جب کہ دو موذیوں میں ہو کھٹ پٹ ــــ اپنے بچنے کی فکر کرو جھٹ پٹ
نہ میٹھا بن کہ چٹ کر جائیں بھوکے ــــ نہ کڑوا بن کہ جو چکھے سو تھوکے
بشر کو صبر نہیں ورنہ یہ مثل سچ ہے ــــ کہ چپ کی داد غفور الرحیم دیتا ہے
دل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے ــــ جو رنج کی گھڑی بھی خوشی میں گزار دے
یہ کام نہیں آساں ، انسان کو مشکل ہے ــــ دنیا میں بھلا ہونا ، دنیا کو بھلا کرنا
آئینہ منھ پہ برا اور بھلا کہتا ہے ــــ سچ یہ ہے صاف جو ہوتا ہے صفا کہتا ہے
نیکی کا لطف یہ ہے انسان کر کے بھولے ــــ احسان کا مزہ ہے احسان کر کے بھولے
سدا دور دوراں دکھاتا نہیں ــــ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
کسی کی بدی تو نہ کر عیب ہے ــــ کہ اُس کا خدا عالم الغیب ہے

میرا ادبی نقطۂ نظر

پروفیسر وہاب اشرفی

’’میں ادب میں آفاقیت کا قائل ہوں، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے بہترین ادب کا وسیع مطالعہ ہی کسی نقاد کی نگارشات کو وقیع بنا سکتا ہے، ورنہ مقامی روایات کی زنجیر میں جکڑا ہوا پسماندہ ادب اُسے ہمیشہ عظیم نظر آئے گا اور پھر اس کی رائے اور تجزیہ کے نتیجہ میں جو ادب پیدا ہوگا، وہ بھی یقیناً گھٹیا اور بے وزن ہوگا۔ ایسی صورت میں مغربی شعروادب اور تنقید کی طرف بار بار مڑکر دیکھنا کتنا ضروری ہے، سمجھنے کی بات ہے۔ مغرب سے استفادہ کرنے والے شاعروں، ادیبوں اور نقادوں کو مغرب زدہ، فیشن پرست وغیرہ کہنا نادانی ہے یا احساس کمتری کا مظاہرہ۔ شعروادب کے بارے میں میرا نقطہ نظر میرے مضامین سے واضح ہے۔ میں ادب کو پروپگنڈہ نہیں سمجھتا، نہ ہی اسے کسی سیاسی منشور کا ترجمان مانتا ہوں۔ اقتصادیات سے ادب کو بیر نہیں، لیکن ادب اقتصادی مسائل کی کھتونی نہیں، نہ ہی یہ جنسیات کا پشتارہ ہے۔ ادب کی ایک ہی منطق ہے اور وہ منطق ہے جمالیات کی۔ کوئی موضوع اپنے آپ میں وقیع نہیں، فن کار کا احساس جمال اُسے وقیع بنا دیتا ہے، اس لئے میری نگاہ میں کسی ادب پارے میں ’کیا کہا گیا ہے‘ اتنا اہم نہیں جتنا ’کیسے کہا گیا‘ اہم ہے۔ میں ادبی رجحانات کو متعلقہ ادب کی زندگی کی علامت سمجھتا ہوں۔ کسی ادب میں تعطل اور جمود اس کے زوال کی نشانی ہے، لہٰذا نئی ادبی تحریکوں یا نئے تجربوں کو رد کر دینا مستحسن نہیں ہے، ان پر غور وفکر ضروری ہے۔ تمام نئی تحریکیں، تمام نئے تجربے سچے نہیں ہوتے، لیکن جو سچے ہوتے ہیں وہ بے حد قیمتی ہوتے ہیں۔ ان ہی سے ادب کو نئی زندگی ملتی ہے اور اس میں توانائی آتی ہے۔ میں اردو ادب کے قدیم و جدید رویے کو اسی آئینہ میں دیکھتا ہوں، لہٰذا ترقی پسندی میری چڑ نہیں ہے، نہ ہی جدیدیت میرا آئیڈیل ہے۔ ہاں تکرار اور فرسودگی کے مقابلے میں جدت اور انفرادیت کی قدر کرتا ہوں کہ یہی اوصاف ادب کو نئے امکانات سے روشناس کرتے ہیں اور اس کے ارتقا کا سبب بنتے ہیں۔‘‘ (پیش لفظ ’’معنی کی تلاش‘‘، مطبوعہ ۱۹۷۸ء، ص ۷ وص ۸)

سیدعبدالوہاب المعروف بہ وہاب اشرفی ابن سید شاہ حاجی امام الدین ابن سید شاہ سلطان اشرف، موضع بی بی پور، کاکو، جہان آباد میں ۲/جون ۱۹۳۶ء کو پیدا ہوئے۔ گاؤں کے مدرسہ میں ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۵۱ء میں رحمت اللہ ہائی اسکول، ڈھاکہ سے میٹرک، سٹی کالج کلکتہ سے ۱۹۵۴ء میں انٹر اور ۱۹۵۶ء میں سنٹرل کالج کلکتہ سے انگریزی آنرس کیا، پھر بہار یونیورسٹی مظفرپور سے انگریزی، اردو اور فارسی میں ایم۔اے، ۱۹۶۸ء میں ڈاکٹریٹ اور ۱۹۶۹ء میں بی ایل کی سند حاصل کیا۔ وہاب اشرفی کی عملی زندگی کا آغاز لائف انشورنس کمپنی میں ملازمت سے ہوا، پھر پٹنہ اور مظفرپور کے کالجوں میں عارضی تدریسی ملازمت سے گزرنے کے بعد جولائی ۱۹۷۶ء سے مارچ ۱۹۹۴ء تک وہ رانچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں پروفیسر رہے اور صدر شعبہ کے منصب تک پہنچے، علاوہ ازیں وہ بہار یونیورسٹی سروس کمیشن اور بہار انٹرمیڈیٹ ایجوکیشنل کاؤنسل کے چیرمین بھی رہے اور ۲۰۰۲ء میں ملازمت سے سبکدوشی کے بعد تاحین حیات تمام تر علمی و تصنیفی مشاغل میں اپنے اوقات عزیز صرف کرتے رہے، یہاں تک کہ ۱۵ جولائی ۲۰۱۲ء کو پٹنہ میں وفات پائی اور درگاہ بی بی پور سے ملحق قبرستان میں مدفون ہوئے۔ سات جلدوں پر مشتمل ’’تاریخ ادبیات عالم‘‘ اور چار جلدوں پر مشتمل ’’تاریخ ادب اردو‘‘ کے علاوہ ’’معنی کی تلاش‘‘، ’’آگہی کا منظر نامہ‘‘، ’’اردو فکشن اور تیسری آنکھ‘‘، ’’مابعد جدیدیت: ممکنات و مضمرات‘‘ اور خودنوشت ’’قصہ بے سمت زندگی کا‘‘ ان کی اہم اور معروف کتابیں ہیں۔

ZABAN-O-ADAB

Monthly Journal of Bihar Urdu Academy

(Under The Department of Minority Welfare, Govt. Of Bihar)

Registered with Registrar, News Paper of India R.N.No.- 26469/75

SSPOST Regd. No.- PT- 58 upto- 31-12-2026

Bihar Urdu Academy, Urdu Bhawan, Ashok Rajpath, Patna - 800004

Volume : 45 | **June - 2024** | **No. 06**

ایڈیٹر، پبلشر ابرار احمد خان ، سکریٹری بہار اردو اکادمی نے پاکیزہ آفسیٹ پریس، شاہ گنج، درگاہ روڈ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۶ میں
طبع کرا کے دفتر بہار اردو اکادمی، اردو بھون، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ سے شائع کیا

Printed and published by *Ibrar Ahmad Khan* Editor & Secretary Bihar Urdu Academy, on behalf of Bihar Urdu Academy, Urdu Bhawan, Patna-4 through Pakiza Offset Press Shahganj, Dargah Road, Patna - 800006

Rs. 15